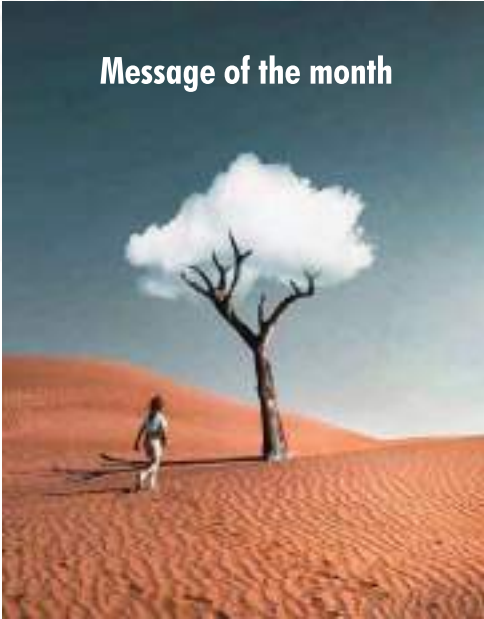




نونهالانِ پاکستان کی تعلیم و تربیت اور صحت و مسرت کے لیے
ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان کے زیر اہتمام شائع کیا گیا۔

شہید پاکستان حکیم محمد سعید
مدیر اول
مسعود احمد برکاتی مرحوم
بہ یاد



قرآنی آیات اور احادیث نبویؐ پر مبنی صفحات کا احترام ہم سب پر فرض ہے۔

قیمت خاص نمبر ۸۰ روپے
قیمت عام شمارہ ۵۰ روپے
سالانہ (رجسٹری سے) ۸۰۰ روپے سالانہ (عام ڈاک سے) ۶۰۰ روپے
سالانہ (دفتر سے دستی لینے پر) ۵۰۰ روپے سالانہ (غیر ممالک سے) ۶۰۰ امریکی ڈالر

ڈاک خانے کے نئے قاعدوں کی وجہ سے آئندہ ہمدرد نونهال کی قیمت صرف ہینک
ڈرافٹ یا منی آرڈر کی صورت میں قابل قبول ہوگی۔ VPP بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

مسلل اشاعت کا ۶۷ سال

سن آغاز ۱۹۵۳ء

ماہ نامہ
ہمدرد نونهال

دسمبر ۲۰۱۹ء

ربیع الثانی ۱۴۴۱ ہجری

شمارہ نمبر ۱۲ - جلد ۶۷

صدر مجلس

سعدیہ راشد

مدیر اعلیٰ

محمد سلیم مغل

معاون مدیر

سلیم فرخی

کیپوزنگ

محمد اکرم خان

۱۶ویں منزل، بحریہ ٹاؤن ٹاور، طارق روڈ،

پی ای سی ایچ ایس بلاک ۲، کراچی۔

فون: 021-38244000, 38241611 Ext. 1611

ای میل: hfp@hamdardfoundation.org

ویب سائٹ: www.hamdardfoundation.org

ویب سائٹ ادارہ سعید: www.hakimsaid.info

فیس بک پیج: f /hamdardfoundationpakistan

چلتا سحر سحر یہ راشد نے ماس پرنٹرز کراچی سے چھپوا کر
ادارہ مطبوعات ہمدرد، ناظم آباد کراچی سے شائع کیا۔



اس شمارے میں

کیا اور کہاں؟

دسمبر ۲۰۱۹ء

۵ ایک خدا ہے (حمد) شریف شیوہ

۶ جاگو گاؤ شہید حکیم محمد سعید

۷ پہلی بات (اداریہ) سلیم مغل

۹ عظیم قائد چودھری اسد اللہ خاں

۱۱ روشن خیالات ننھے گل چین

۱۳ دو تیل تھے بچارے سلیم مغل

۱۵ سردی کا موسم (نظم) ارسلان اللہ خاں

۱۶ یہ منہ اور مسور کی دال راؤ جی

۲۱ قائد اعظم کے مشغلے ظل ہما

۲۴ پانچ لاکھ محمد محمود احمد

۲۷ علم در پیچے تکتہ داں نونہال

۳۱ اُن دیکھی رو مسعود احمد برکاتی

۳۳ شین شرارت ننھے مزاح نگار

۳۷ پانی کا قطرہ (نظم) تنویر انجم

۳۹ ہیرا پھیری عشرت جہاں

۴۲ نونہال مَصور ننھے فن کار



یہ منہ اور مسور کی دال 16



قائد اعظم کے مشغلے 21



ہیرا پھیری 39



47 اسٹیو جابز کے نام



76 افواہ سازی



80 محنت کا جادو



97 کہانی کا بل میاں کی

۴۵ مرے قائد اعظم (نظم) شمس القمر عاکف

۴۷ اسٹیو جابز کے نام - سفر نامہ امریکا سلیم مغل

۵۲ نونہال مشاعرہ خوش ذوق نونہال

۵۳ نام بوجھیے س۔ ف

۵۹ بلاعتوان انعامی کہانی احمد عدنان طارق

۶۸ ننھی منی چڑیاں شیخ عبدالحمید عابد

۷۲ نونہال خبر نامہ سلیم فرخی

۷۴ توپ کے دہانے میں نیند ابن انشا

۷۵ گنتی کا گیت (نظم) ایف۔ سلطانہ مہر

۷۶ افواہ سازی رابعہ فاروق

۸۰ سیدھے کا الٹا شکیل صدیقی

۸۰ محنت کا جادو عرفان الحق

۸۸ معلومات افزا ۲۸۸ س۔ ف

۹۱ جوابات معلومات افزا ۲۸۶ ادارہ

۹۳ بچوں کے جمیل جالبی رانا محمد شاہد

۹۷ کہانی کا بل میاں کی بینا صدیقی

۱۰۳ نونہال ادیب ننھے لکھنے والے

۱۱۳ آدھی ملاقات نونہال پڑھنے والے

۱۱۸ انعامات بلاعتوان کہانی ادارہ

۱۲۰ نونہال لغت ادارہ



۹ جنوری ۱۹۲۰ء

اس عظیم شخصیت کا جنم دن جس نے وطن عزیز میں

- قدم قدم پر آگہی کے چراغ جلانے
- درس گاہیں بنائیں اور علم و ادب کو فروغ دیا
- نونہالوں کو زندگی کا قرینہ سکھایا اور آگے بڑھنے کی اُمتیں دیں
- نوجوانوں کو بلند پروازی اور دور بینی کے سبق پڑھائے
- طب مشرق کو معیار، تکریم، اعتبار اور صنعت کا درجہ عطا کیا
- صحت کی دولت تقسیم کی اور صحت مند روٹیوں کو فروغ دیا
- سب سے بڑھ کر تعمیر پاکستان کا خواب دکھا کر تعبیریں پانے کا ہنر سکھایا

جنوری ۱۹۲۰ء کو شہید حکیم محمد سعید کے سو سالہ یوم ولادت کے طور سے منایا جا رہا ہے
آئیے وطن عزیز کے عظیم محسن اور شہید پاکستان کو خراج تحسین پیش کریں

دعائیں..... پھولوں کے سوغات..... اچھی تحریر..... خوب صورت شعر
حکیم صاحب کی کتاب کا مطالعہ..... پابندی وقت کو اپنی عادات کا حصہ بنانے کا عہد

آپ کا ہر اچھا عمل اس صد سالہ تقریب میں شرکت اور شمولیت ہی کی صورت ہوگا

ایک خدا ہے

شریف شیوہ

فلک ، زمیں اور چاند ستارے دریا ، نہریں چشمے سارے
بلبل تنلی ، جگنو پیارے دیتا ہے جو سب کو سہارے
ایک خدا ہے!

اُجلے دن اور کالی راتیں سردی گرمی اور برساتیں
ہاتھ اور پاؤں ، کان اور آنکھیں جس نے دی ہیں یہ سوغاتیں
ایک خدا ہے!

پتا پتا بُوٹا بُوٹا بہتا دریا ، پھیلا صحرا
بھکڑ یہ منہ زور ہوا کا اس کا خالق کون ہے تنہا!
ایک خدا ہے!



جاگو جگاؤ



نونہال دوست، شہید حکیم محمد سعید کی یاد رکھی جانے والی باتیں

ہمارا پیارا ملک پاکستان کس کی عقل مندی اور کوشش سے بنا؟ سب جانتے ہیں کہ قائد اعظم محمد علی جناح اس عظیم ملک کے بانی تھے۔ قائد اعظم نے یہ ملک کیوں بنایا تھا؟ اس لیے بنایا تھا کہ مسلمانوں کو ایسا گھر مل جائے جو ان کا اپنا گھر ہو، جس میں ان کی اپنی مرضی چلے، جس میں کوئی ان کو ستانے والا نہ ہو، جہاں وہ اپنے مذہب پر سکون سے عمل کر سکیں۔ جہاں ان کی محنت کا پھل انھی کو ملے، جہاں وہ مل جل کر، ایک دل ہو کر سب کی بھلائی کے لیے کام کریں اور خوب ترقی کریں، خوب علم حاصل کریں۔ جہاں انصاف ہو، جہاں اچھے کام کرنے سے کوئی نہ روکے، جہاں بُرے کام کرنے کی اجازت نہ ہو۔

اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا پاکستان میں یہ سب خوبیاں ہیں؟ پاکستان ایسا بن چکا ہے جیسا قائد اعظم اس کو بنانا چاہتے تھے؟

واقعی پاکستان، ہمارا پاکستان ابھی ویسا پاکستان نہیں بنا جو قائد اعظم کی خواہش کے مطابق ہو۔ تو آؤ اب ہم پاکستان کو قائد اعظم کی خواہش کے مطابق بنائیں۔ آؤ یہاں انصاف قائم کریں۔ آؤ اپنا اپنا فرض ادا کریں اور دوسروں کے حقوق ان کو دیں۔ آؤ ایمان داری سے، سادگی سے اور کفایت سے زندگی گزاریں۔ آؤ مل جل کر محبت، خلوص، امن اور اتحاد کے ساتھ رہیں۔ کسی سے نہ لڑیں، کسی کو بُرا نہ کہیں، کسی کو دکھ نہ پہنچائیں۔ آؤ لالچ اور دولت کی ہوس چھوڑ کر علم کی دولت حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ علم اور اخلاق ہی سب سے بڑی دولت ہے۔ اسی دولت سے پاکستان ترقی کرے گا۔

(ہمدرد نونہال دسمبر ۱۹۸۹ء سے لیا گیا)



پہلی بات

سلیم مغل

کہانی اُس وقت بھی سنی جاتی تھی جب انسان چھوٹے چھوٹے گروہوں اور قبیلوں کی صورت میں رہا کرتا تھا اور اس وقت بھی جب وہ جنگلوں، پہاڑوں اور درختوں پر رہتا تھا، مگر مل جل کر رہنا سیکھ چکا تھا..... کہانی ہماری پرانی سہیلی ہے، یہ اس وقت بھی موجود تھی جب راستوں کا تصور پگڈنڈیوں سے آگے نہ جاتا تھا اور ان دنوں بھی جب انسان بے خبری کی زندگی گزارتا تھا اور اسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ چند کوس پر رہنے والے لوگ کون ہیں؟

آپ یقین کریں کہ عدم آگہی کے ان تمام ادوار میں بھی ”کہانی“ سنی جاتی تھی، سنائی جاتی تھی، چوپالیں جمتیں اور بڑے بوڑھے کہانیاں سناتے اور کہانیاں بھی کچھ یوں سناتے کہ سننے والوں کی پلک نہ جھپکتی اور سانسیں رک رک جاتیں۔ رات کو سونے سے قبل مائیں، نانیاں اور دادیاں بچوں کو عبادتوں کی سی پابندی سے کہانیاں سناتیں۔ یہ ابھی دور کی بات نہیں جب قصہ گوئی ایک فن تھا اور قصہ گو اس فن کی مہارت سے ہجوم کو مبہوت کر دیتے، جیسے ان پر جادو سا کر دیا ہو۔ پشاور کا قصہ خوانی بازار خود قصہ خوانی کی اہمیت پر کتنی بڑی گواہی ہے۔ حیرت اور تجسس کہانی کے بنیادی اوصاف ہوتے اور نظر نہ آنے والی دنیاؤں کی مخلوق کہانیوں کے موضوعات بنتے۔ چاند پر چرخہ کاتتی ہوئی بڑھیا، کوہ قاف کے جن اور پریاں..... اور بے نام سلطنت کے شہزادے اور شہزادیاں اور..... چڑیلیں..... اور جادوگر..... یہ سب کہیں اور سے نہیں، کہانی ہی سے آئے ہیں۔ کہانی نہ

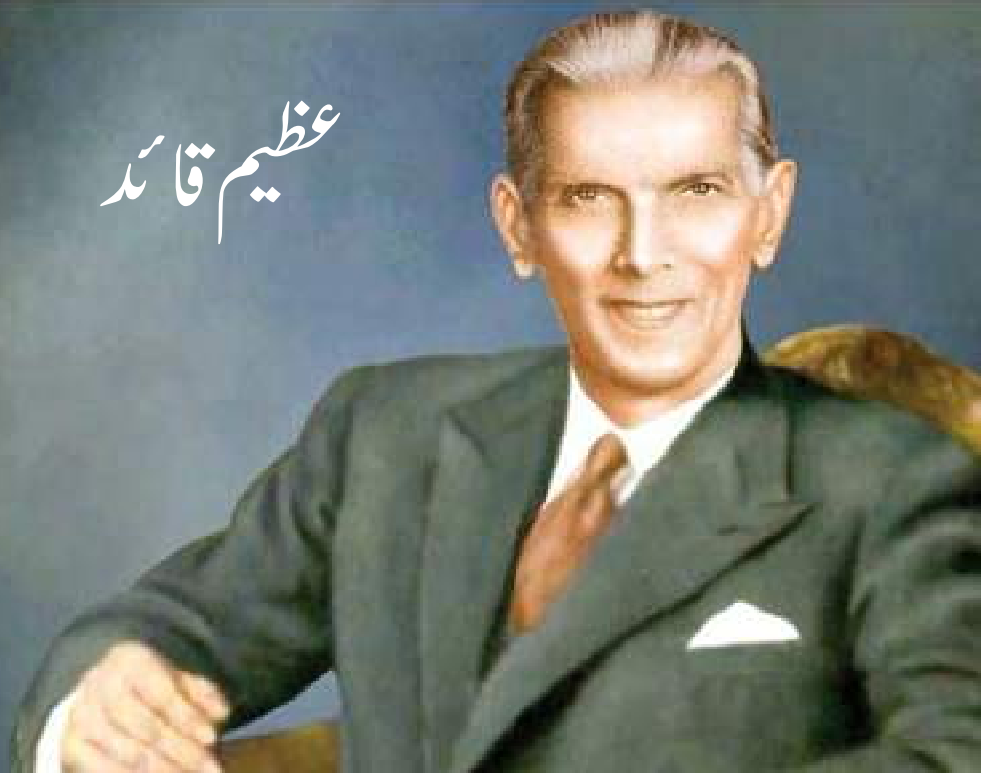
ہوتی تو سوچنے کا سفر سُست پڑ جاتا۔ ترقی کی رفتار دھیمی رہتی۔ سوچے نا کہ کوئی کہانی نگار کسی شہزادے کو قالین پر نہ اڑاتا تو جہاز کہاں سے آتا؟ اور اگر جادوگر اپنے طلسمی آئینے میں دنیا کے مناظر نہ دکھاتا تو ٹی وی کیسے ایجاد ہوتا۔ ہم نے یہی دیکھا اور یہی جانا کہ ایجاد سے قبل ایجاد کا تصور آیا اور ”کہانی“ کے ذریعے ہی آیا۔ کہانی دراصل تصور، تخیل اور تخلیق کو جنم دینے والا سب سے بڑا اہم اور قدیم اسلوب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر عہد کہانی کا عہد ہے۔ ذرا سا انداز اور اظہار کے اسلوب بدل کر اور کبھی موضوعات اور ماحول کی تبدیلی کے ساتھ ”کہانی“ ہر دور میں، ہر تہذیب میں موجود رہی..... اور اگر واقعی ایسا ہے اور یقیناً ایسا ہے تو پھر مان لیجیے کہ انسانی صلاحیتوں کی نشوونما کے لیے کہانی کو فطرت نے موزوں ترین سمجھا اور اسے انسان کی فطری ضرورتوں میں شامل کر دیا۔ ”کہانی“ دیکھتے ہی دیکھتے ایک بار پھر نئے عہد کا بھی بہت بڑا مضمون بن گیا ہے۔ دنیا بھر میں اسٹوری رائٹنگ اور اسٹوری ٹیلنگ (کہانی لکھنا اور سننا) اسکولوں کے لازمی مضامین بن چکے ہیں۔ نشوونما پاتے ہوئے ننھے ذہنوں کی زرخیزی اور آبیاری کے لیے ”کہانی“ صرف ضروری نہیں، اشد ضروری ہے۔ سواگر آپ نو نہال ہیں تو کہانی پڑھا کریں اور لکھا بھی کریں، اُستاد یا ماں باپ ہیں تو کہانی سنایا کریں اور اگر قلم کار ہیں تو تسلسل کے ساتھ کہانی لکھا کریں۔ محنت کے ساتھ، محبت کے ساتھ اور ریاضت کے ساتھ کہانی لکھنے اور پڑھنے کا سفر جاری رکھیں۔ دیکھیے گا ایک دن آپ کی کہانی کا جادو سرچڑھ کر ضرور بولے گا۔ بڑے معرکے سر کرنے کے لیے آج کے نو نہال آپ ہی کی کہانیوں سے اُمتیں اور تحریک لیں گے..... ہاں مگر خیال رہے اچھی کہانی لکھنا آج بھی اتنا آسان نہیں۔ کہانی جس پہ پلک نہ چھپکے، جسے سنتے ہوئے دیدے پھر کے ہو جائیں، حیرت آنکھوں سے پھٹی پڑ رہی ہو اور سننے یا پڑھنے والا اپنی جگہ سے ہلے بغیر نئی دنیاؤں کے سفر پر چل نکلے۔ تو پھر لکھیے ایک نئی سی کہانی۔ ڈراتی ہوئی، سہاتی ہوئی، نت نئے کرداروں سے ملواتی ہوئی، کہانی، جسے پڑھ کر کبھی اُمتیں جاگیں اور کبھی حوصلہ اور ہمیز۔ ایک اچھی سی کہانی جو سوچ کے نئے سفر پر لے جائے اور وہیں سے کام بایوں کے نئے اُفق پر۔

قائد اعظم کی خوش مزاجی

چودھری اسد اللہ خاں

قائد اعظم بچپن سے زندگی کے آخری لمحات تک، راست گو، خوش گفتار، خوش لباس اور با اصول انسان رہے۔ وہ بہت کم بولتے تھے۔ وہ زیادہ سے زیادہ کام کرنے کے عادی تھے۔ ان کے اس طرز زندگی کو دیکھتے ہوئے اکثر لوگ جناح صاحب کو گھڑے مزاج کا انسان سمجھتے تھے، لیکن ایسا ہرگز نہیں تھا۔ وہ بہت خوش مزاج تھے۔ آئیے ان کی خوش مزاجی کے صرف تین واقعات آپ کو سناتے ہیں:

عظیم قائد



۱۔ ایک دفعہ مسٹر گاندھی نے قائد اعظم سے پوچھا کہ آپ کو کس نام سے پکارا جائے؟ آپ نے جواب دیا کہ گلاب کے پھول کو جس نام سے بھی پکارا جائے اس کی خوشبو میں کچھ فرق نہیں آتا۔

۲۔ مارچ ۱۹۴۰ء مسلم لیگ کے اجلاس لاہور میں ”قرار داد پاکستان“ پر بحث ہو رہی تھی اور قائد اعظم تقریر فرما رہے تھے کہ باہر اچانک شور بلند ہوا۔ قائد اعظم نے پوچھا: ”یہ شور کیسا ہے؟“

ایک شخص نے بتایا کہ شیر بنگال (مولوی فضل الحق) آئے ہیں۔ اتنے میں مولوی فضل الحق پنڈال میں داخل ہوئے۔ قائد اعظم نے ان کو دیکھتے ہی مسکرا کر فرمایا: ”جب شیر آئے تو مینے کو بیٹھ جانا چاہیے۔“ یہ کہہ کر کرسی پر بیٹھ گئے۔

جب مولوی فضل الحق کو جگہ مل گئی تو قائد اعظم یہ کہہ کر پھر کھڑے ہو گئے: ”اب شیر کو زنجیروں میں جکڑ دیا گیا ہے۔ اس لیے مینہ پھر باہر نکل آیا ہے۔ اس پر حاضرین ہنس ہنس کر بے حال ہو گئے۔

۳۔ ۱۹۴۷ء میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ہندوستان کے مشہور لیڈروں سے ملاقات کا سلسلہ شروع کیا۔

قائد اعظم سے ملاقات کے وقت لارڈ ماؤنٹ بیٹن، لیڈی ماؤنٹ بیٹن اور قائد اعظم کی تصویر لی جا رہی تھی۔ قائد اعظم نے یہ خیال کرتے ہوئے کہ لیڈی ماؤنٹ بیٹن، ہم دونوں کے درمیان کھڑی ہوں گی تو انھوں نے مزاح کے طور پر لیڈی ماؤنٹ بیٹن سے مخاطب ہو کر کہا: ”آپ تو کانٹوں کے درمیان پھول ہیں۔“

لیکن عین موقع پر جب تصویر لی جا رہی تھی تو لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور لیڈی ماؤنٹ بیٹن نے قائد اعظم کو درمیان میں کھڑا کر دیا۔ تو یوں قائد اعظم خود کانٹوں کے درمیان پھول بن گئے۔



تجربے اور دانائی کا حاصل، علم و حکمت کی باتیں

واصف علی واصف

ناپسندیدہ انسان سے پیار کرو، اس کا کردار بدل جائے گا۔
ماہین سہیل، بلدیہ ٹاؤن

نسیم حجازی

قدرت کسی قوم کے اجتماعی گناہ کو معاف نہیں کرتی۔
اقبال جنید، لاہور

وکٹر ہیوگو

کسی کی مدد کرنے سے جیب ضرور خالی ہو جاتی ہے،
لیکن دل خوشی سے بھر جاتا ہے۔
شازیہ ربانی، پشاور

آسکر وائلڈ

بعض لوگ جہاں جاتے ہیں، اپنے ساتھ خوشیاں لے
جاتے ہیں اور بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں، جن کے چلے
جانے سے خوشی ہوتی ہے۔
احمد وسیم، ملتان

گوئے

جو اپنے لیے اُصول نہیں بناتا، اسے دوسروں کے
بنائے ہوئے اُصولوں پر چلنا پڑتا ہے۔
سید علی رضا، فیصل آباد

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

ایمان کے بعد افضل ترین نیکی خلق خدا کو آرام پہنچانا ہے۔
سیدہ اریبہ بتول، لیاری ٹاؤن

حضرت علیؓ

جو کام دنیا کے سامنے نہیں تو چھپا کر بھی نہ کرو۔
محمد معین انصاری، کراچی

حضرت حسن بصریؒ

ہزاروں آدمیوں کی دوستی بہتر ہے، لیکن ایک آدمی کی
دشمنی بدترین ہے۔

محمد منیر نواز، ناظم آباد

ابن جوزی

اصل کمال علم اور عمل دونوں کو جمع کرنے میں ہے۔
صبا طارق، سکھر

قائد اعظم محمد علی جناح

قلم کی طاقت تلوار سے بڑھ کر ہے۔
لیلیٰ آصف، کوئٹہ

Press ad

Page 12



دوبیل تھے بچارے

عربی زبان کی مشہور کہاوت پر مبنی
قتلت یوم قتل الثور الابيض
(میں تو اسی روز قتل ہو گیا تھا جس روز سفید بیل قتل ہوا تھا)

کسی جنگل میں دوبیل رہتے تھے ایک لال اور
ایک سفید جن کی آپس میں گہری دوستی
تھی۔ ایک ساتھ گھومنا پھرنا اور چرنے کے
لیے بھی ایک ساتھ آنا جانا۔
ان کی اس مثالی دوستی کی وجہ سے اس جنگل کا
شیر ان پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا تھا، اس نے جب
کبھی ان میں سے کسی ایک پر حملہ کیا تو دونوں
نے مل کر اس کی وہ درگت بنائی کہ شیر کو اپنی



جان کے لالے پڑ جاتے۔

شیر نے ایک چال چلی لال نیل سے چکنی چپڑی
باتیں کر کے اور روشن مستقبل کے سہانے سپنے
دکھا کر اپنے ساتھ ملا لیا لال نیل اس کی باتوں
میں آ گیا کہ نیل کی دوستی کے مقابلے میں شیر کی
دوستی زیادہ محفوظ نظر آرہی تھی۔

لال نیل جب شیر سے

مل گیا اور سفید

نیل اکیلا رہ گیا

تو چند دنوں

کے بعد شیر

نے اس کے

شکار کا پروگرام

بنایا اور اس پر حملہ کر

دیا۔ پہلے تو دونوں مل کر شیر

کو بھگا دیا کرتے تھے مگر اب اکیلے نیل کیلئے

شیر کا مقابلہ مشکل ہو گیا۔

سفید نیل نے اپنے ساتھی نیل کو بہت پکارا،

بہت آوازیں دیں، پرانی دوستی کے واسطے

دیے اور نیل ہونے کے ناطے بھائی چارے

کا احساس دلایا، مگر شیر کی دوستی کے نشے سے
سرشار لال نیل ٹس سے مس نہ ہوا اور اپنی
برادری کے ایک فرد کو شیر کے ہاتھوں چیر پھاڑ
کا شکار ہوتا دیکھتا رہا۔

وہ آج بہت خوش اور مطمئن تھا کہ شکر ہے
میں اس کے ساتھ نہیں تھا ورنہ آج

میرا کام بھی اس کے ساتھ

ہی تمام ہو جاتا۔

تھوڑے دن

گزرے کہ شیر نے

اسے بھی شکار کرنے

کا پروگرام بنا لیا۔

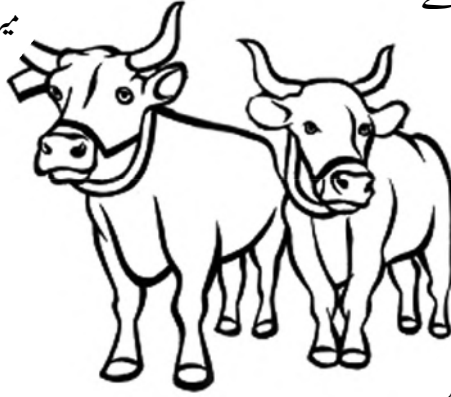
جب شیر نے اس پر حملہ

کیا تو لال نیل نے زور سے

ڈکارتے ہوئے جنگل کے باشندوں کو

یہ پیغام دیا کہ.... (میں تو اسی دن قتل ہو گیا تھا

جس دن سفید نیل قتل ہوا تھا)۔



سردی کا موسم

ارسلان اللہ خان

دوستو! سردی کا موسم آگیا
کوٹ اور جیکٹ سنبھالو ساتھیو!
دیکھ کر سردی، ہوا کو بھانپ کر
روز ہی تم سوپ اور تھوہ پیو
رات کو ہیٹر جلانا چاہیے
اس سے بچنے کا کریں کچھ اہتمام
جب نہاؤ تم تو گیزر کھول دو
ارسلان! بادام، پستے کھاؤ تم

پھر چلی ہے تیز تیغ بستہ ہوا
گرم کپڑوں کو نکالو ساتھیو!
گھر سے نکلو خوب خود کو ڈھانپ کر
اپنے کانوں اور پیروں کو ڈھکو
نیند سے پہلے بچھانا چاہیے
ہو نہ جائے آپ کو نزلہ زکام
اور جب نکلو تو چادر اوڑھ لو
پھر رضائی اوڑھ کر سو جاؤ تم



یہ منہ اور مسور کی دال

راؤ جی



۱۸۵۷ء میں مغلیہ سلطنت کے مکمل خاتمے کے بعد مغل دربار، شاہی قلعہ اور شاہی محلات سب اُجڑ گئے۔ یہاں رہنے والوں پر جو گزری وہ الم ناک و دل خراش حالات تاریخ کا حصہ ہیں۔ شاہی محلات کے تمام ملازمین بے کار اور بے روزگار ہو کر تلاشِ معاش کے لیے دربارہ بھٹکنے لگے۔ ان میں ایک شاہی باورچی غلام رسول بھی تھا، جو کھانا بنانے کا ماہر اور اپنے فن میں اپنی پہچان رکھتا تھا، لیکن دہلی میں کوئی ایسا صاحبِ ذوق نہیں رہا تھا جو اس کے فن کی قدر دانی کرتا اور اسے اپنے ہاں ملازم رکھ لیتا۔ ہر طرف افرا تفری کا عالم تھا اور یہ قول آخری مغل تاج دار بہادر شاہ



ظفر، شرفا کی حالت یہ تھی کہ جسے دیکھا حاکم وقت نے، کہا یہ تو قابلِ دار ہے۔
مرزا غالب بھی تختہ دار پر چڑھنے سے بال بال بچے۔ انھوں نے خود اپنے دوست نواب شیفتہ کو
بتایا کہ انھیں جب انگریز کرنل کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے سوال کیا: ”تم کون؟“
”میں شاعر ہوں۔“ مرزا غالب نے جواب دیا۔

”میرا مطلب تم ہندو یا مسلمان؟“ کرنل نے سوال کیا۔

”آدھا مسلمان۔“

”آدھا کیوں؟“

”شراب پی لیتا ہوں، لیکن سور کا گوشت نہیں کھاتا۔“

مرزا غالب نے نواب شیفتہ کو بتایا: ”میرے اس جواب پر کم بخت کوہنسی آگئی اور ہنستے ہنستے اس نے بانیں
ہاتھ کے انگوٹھے سے اشارہ کر دیا اور میری جان چھوٹ گئی۔ اگر وہ دائیں ہاتھ کے انگوٹھے کا اشارہ کر دیتا
تو میں بھی کسی درخت پر مردہ لٹکا ہوا آپ کو ملتا جیسے اور بہت سے مجھ جیسے وہاں لٹکے ہوئے تھے۔“

غلام رسول روزگار کی تلاش میں دہلی سے نکل کر ادھر ادھر بھٹکتا رہا آخر کار پھرتا پھرتا وہ مشرقی
پنجاب کے ایک قصبے بیلاس پور جا پہنچا۔ وہاں ایک بڑے مسلمان زمیندار رہتے تھے جو بہت سے
گاؤں کے مالک تھے اور کھانے پینے کے شوقین تھے۔ غلام رسول نے سوچا کہ یہاں اس کی دال
گل جائے گی۔ وہ زمیندار صاحب کی حویلی پہنچا اور آداب و سلام کے بعد آنے کا مقصد بیان کیا۔
”کیا کیا پکالیتے ہو؟“ زمیندار صاحب نے سوال کیا۔

”جو آپ کھانا پسند فرمائیں گے۔“

”میں پوچھنا یہ چاہتا ہوں کہ کوئی خاص چیز؟“ زمیندار صاحب بولے۔

”میرا پکایا ہوا ہر کھانا، ہر چیز خاص ہوتی ہے۔ میں آخر شاہی باورچی رہا ہوں۔“

”پھر بھی کوئی خاص چیز۔“

”میں مسور کی دال ایسی پکا سکتا ہوں کہ آپ لب چاٹتے رہ جائیں۔“

”اچھا یہ بات ہے تو ہم سب سے پہلے مسور کی دال ہی کھائیں گے۔ ہم بھی تو دیکھیں تم دال میں کیا خوبی پیدا کرتے ہو۔“ زمیندار نے دل چسپی لیتے ہوئے کہا۔

”جناب! آپ اپنے تمام دوست احباب کو مدعو کریں، وہ بھی داد دیں تو پھر بات ہے نا۔“

”یہ بات ہے تو چلو ان کو بھی بلا لیتے ہیں..... اور کچھ؟“ زمیندار صاحب نے کہا۔

”اور یہ کہ دال کا خرچ بعد میں آپ کو مجھے دینا ہوگا۔“ غلام رسول بولا۔

”ویسے تو ہمارے باورچی خانے میں ہر چیز موجود ہوتی ہے، پھر بھی اگر تم کوئی خاص چیز اس میں

ڈالنا چاہو تو اس کے پیسے لے لینا، لیکن یہ تو بتاؤ تم تنخواہ کیا لو گے؟“ زمیندار صاحب نے پوچھا۔

”آپ میرے ہاتھ کی بنی ہوئی مسور کی دال چکھ لیجیے، پھر بتاؤں گا۔“

”جیسی تمھاری مرضی۔“ زمیندار صاحب بولے۔

غلام رسول نے زمیندار صاحب کے باورچی خانے کا چارج سنبھال لیا۔ دوسرے روز پروگرام کے

مطابق اس نے مسور کی دال پکائی۔ زمیندار صاحب نے اپنے تمام دوستوں کو کھانے پر بلایا۔ جب تمام

احباب آگئے تو انھوں نے ان سے کہا: ”دوستو! آج آپ کی صرف ایک پکوان کی دعوت ہے، میرے

نئے باورچی نے اس کے ساتھ کوئی اور پکوان بنانے سے انکار کر دیا اور کہا کہ اگر صرف اس ایک پکوان

سے ہی مزہ نہ آجائے اور سب اپنے لب چاٹتے ہوئے نہ رہ جائیں تو وہ شاہی باورچی نہیں۔“

”ایسی کون سی ڈش ہے؟“ سب دوستوں نے بہ یک زبان سوال کیا۔

”مسور کی دال۔“ زمیندار صاحب بولے۔

”مسور کی دال۔“ بے ساختہ سب احباب کے منہ سے نکلا اور حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

کھانا پیش کیا گیا۔ جو شاہی باورچی نے کہا تھا وہ درست ثابت ہوا۔ تمام مہمان اور زمیندار

صاحب بھی انگلیاں چاٹتے رہ گئے۔ انھوں نے تعریفوں کے پل باندھ دیے۔ زمیندار صاحب

بھی بڑے خوش تھے کہ انھیں ایک بہترین باورچی مل گیا۔

تمام مہمانوں کے رخصت ہونے کے بعد، زمیندار صاحب نے تعریفی نظروں سے غلام رسول کی

طرف دیکھا تو اس نے دال پر اُٹھنے والے خرچ کا حساب ان کی طرف بڑھا دیا جس پر لکھا تھا:
 ”دو عدد سونے کی اشرفیاں۔“

”یہ کیا.....؟“ زمیندار صاحب نے سوال کیا۔

”میں نے مسور کی دال میں دو اشرفیوں کا بھگا ردیا ہے، یہ آپ مجھے دے دیجیے۔“ غلام رسول بولا۔
 ”اس کا کیا ثبوت ہے کہ تم نے دو اشرفیوں کا بھگا ردیا ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے؟“ زمیندار صاحب
 حیرت سے بولے۔

”آئیے میرے ساتھ باورچی خانے میں۔“ غلام رسول بولا۔

زمیندار صاحب، غلام رسول کے ساتھ باورچی خانے میں آئے۔ وہاں چولھے پر سیاہ رنگ کی
 اشرفیاں رکھی تھیں جن پر مہر اور وزن وغیرہ ابھی تک نمایاں تھے۔ انھیں زمیندار صاحب کو دکھاتے
 ہوئے اس نے کہا کہ میں نے ان اشرفیوں کا دال میں بھگا ردیا ہے۔ زمیندار نے ان کو ہاتھ لگایا
 تو وہ چوڑھو کر سفوف میں تبدیل ہو گئیں۔

”انھیں تم نے کس طرح جلایا؟“

”بہی تو فن ہے جناب!“ غلام رسول نے جواب دیا۔

”لیکن میرے پاس تو سونے کی اشرفیاں نہیں ہیں۔“ زمیندار صاحب بولے۔

”تو ان کی رقم، میرا مطلب ہے قیمت دے دیجیے، میرے پاس یہ آخری اشرفیاں بچی تھیں۔“
 غلام رسول نے کہا۔

زمیندار صاحب کچھ دیر سوچتے رہے، پھر بولے: ”آؤ میرے ساتھ۔“ وہ غلام رسول کو لے کر
 اپنی بیٹھک میں آئے۔ میز کی دراز سے رقم نکالی اور اسے دیتے ہوئے بولے: ”تم باورچی تو کمال
 کے ہو، لیکن بہت مہنگے ہو۔ میں تمہیں اپنی ملازمت میں نہیں رکھ سکتا۔“

غلام رسول نے رقم جیب میں رکھی، زمیندار صاحب کو سلام کیا اور یہ کہتے ہوئے رخصت ہو گیا
 کہ: ”یہ منہ اور مسور کی دال۔“

اس چیلنج کو آسان نہ جانیے گا۔

تصویر کھینچتے ہوئے فوٹو گرافر کو بغور دیکھیے اور اندازہ لگائیے کہ فوٹو گرافر کے زاویے سے
لی جانے والی تصویر نیچے دی گئی چار تصویروں میں سے کون سی ہے؟





قائد اعظم کے مشغلے

ظلِ ہما

قوموں کی تاریخ میں عظیم شخصیتیں روز روز پیدا نہیں ہوتیں۔ عرصے کے بعد کہیں جا کر کوئی ایسا انسان پیدا ہوتا ہے، جو عظمت کے معیار پر پورا اُترتا ہے۔

قائد اعظم محمد علی جناح ۲۵ دسمبر ۱۸۷۶ء کو کراچی میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی سے آپ کو مطالعے کا بہت شوق تھا۔ وہ پڑھنے کے وقت پڑھتے اور کھیل کے وقت کھیلتے تھے۔ انھوں نے کبھی اسکول کے کام میں سستی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ رات گئے تک وہ مطالعے میں مصروف رہتے، مگر دوسروں کے آرام کا بھی خیال رکھتے۔ رات کو جب مطالعہ کرتے تو مٹی کے تیل والے لیمپ کے ایک طرف گتّا رکھ لیتے، تاکہ گھر کے دوسرے لوگ پریشان نہ ہوں۔

قائد اعظم کو شروع ہی سے دھول مٹی والے کھیلوں سے سخت نفرت تھی، کیوں کہ وہ شروع ہی سے



صفائی پسند تھے۔ کرکٹ کو بہت پسند کرتے تھے۔ وہ جب اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن جانے لگے تو اپنے ایک دوست نانچی جعفر کو اپنی گیند اور بال دیتے ہوئے کہا: ”جب تک میں ملک سے باہر ہوں، تم محلے کے لڑکوں کو کرکٹ کھیلنے کے لیے ہر شام میدان میں لے جایا کرنا اور جو نئے لڑکے آئیں انھیں تربیت دینا، تاکہ وہ دوسرے گندے کھیلوں سے بچے رہیں۔“

جانوروں میں انھیں گھوڑا بہت پسند تھا۔ گھوڑے کی فطرت میں خود اعتمادی شامل ہے، اس لیے وہ اسے بہت پسند کرتے تھے اور اکثر اپنے ایک دوست قاسم کے ساتھ گھڑسواری کرتے تھے۔ چون کہ قائد اعظم خود بے انتہا خود اعتمادی کے مالک تھے، اس لیے خود اعتمادی بہت پسند کرتے تھے۔ گردن جھکا کر جینا ان کے اصولوں کے خلاف تھا۔

قائد اعظم ڈرامے کے بھی شوقین تھے۔ وہ اپنی انتہائی مصروفیات کے دنوں میں بھی اس تفریح کے لیے وقت نکال لیتے تھے۔ لندن میں انھوں نے اسٹیج ڈراموں میں بھی حصہ لینا شروع کر دیا۔ لندن کے مشہور ”شیکسپیر ڈرامیک کلب“ میں ان کو اداکاری کا پیشہ باقاعدہ طور پر اختیار کرنے کی دعوت دی گئی، مگر انھوں نے معذرت کر لی، کیوں کہ وہ ہال میں موجود چند سوانسوں کی بجائے دنیا کے کروڑوں انسانوں کو متاثر کرنا چاہتے تھے۔

قائد اعظم آپ بلیئر ڈ کے کھیل میں بھی کافی مہارت رکھتے تھے۔ جن دنوں وہ بمبئی میں وکالت کرتے تھے، شام کو فارغ ہوتے تو ایک دو بلیئر ڈ کلبوں میں جایا کرتے تھے۔ ان کا شمار بلیئر ڈ کے اچھے کھلاڑیوں میں ہوتا تھا۔ قائد اعظم نے ایک مرتبہ اپنے ایک دوست سے کہا: ”سیاست اور بلیئر ڈ، اس لحاظ سے ملتے جلتے ہیں کہ دونوں میں سوچ سمجھ کر اسٹروک لگانا پڑتا ہے۔“

قائد اعظم بمبئی میں ہوتے یا دہلی میں، دن بھر کی مصروفیات کے بعد شام کو اپنے بنگلے کے لان میں چہل قدمی ضرور کرتے۔ دل چاہتا تو سمندر کے کنارے ہوا خوری کے لیے چلے جاتے۔ شروع میں انھیں گھوڑ دوڑ کا بھی شوق رہا۔ بعد میں دوسرے کاموں میں لگ کر اسے جاری نہ رکھ سکے۔ گھڑسواری کا شوق انھیں ہمیشہ رہا۔ وہ گولف بھی کھیلتے تھے۔ گورنر جنرل بننے کے بعد بھی گولف

کھیلنے کا شوق رہا اور کھیلتے بھی رہے۔

قائد اعظم کو مطالعے کا بے حد شوق تھا۔ کتب بینی اور اخبار بینی آپ کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ روزانہ اخبارات کا مطالعہ کرتے۔ ایک مشہور تبصرہ نگار نے ایک مرتبہ ان کے بارے میں لکھا: ”وہ ایک ایسے لیڈر ہیں، جس کی تمام تر فراست ان معلومات پر مبنی ہے، جو انھیں روزانہ اخبارات کے وسیع مطالعے سے حاصل ہوئی ہیں۔“ قانون اور سیاست میں ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ انگلستان اور امریکا کے راہنماؤں اور مشہور لوگوں کی زندگیاں اور ان کی ولولہ انگیز تقریریں بھی آپ کے زیر مطالعہ رہیں۔ انھیں تاریخی، سیاسی کتب، سوانح حیات اور ڈراموں سے خاص لگاؤ تھا۔

قائد اعظم کو مختلف زبانیں سیکھنے کا بھی بہت شوق تھا۔ انگریزی میں وہ ماہر تھے۔ اس کے باوجود اردو سے انھیں خاص لگاؤ تھا۔ اردو میں تقریر کرنا پسند کرتے تھے۔ قائد اعظم کی عمر کا بیشتر حصہ سیاسی جدوجہد میں گزرا، اس لیے دوسرے تفریحی مشاغل کی طرف خاص توجہ دینے کے لیے وقت نہ مل سکا۔ انھیں قدرتی مناظر سے بھی خاصی دل چسپی تھی۔ کشمیر جاتے تو شام کے وقت شکاریوں میں جا بیٹھتے۔ سیر سے لطف اندوز ہونے کے لیے خوب صورت وادیوں میں گھومتے۔

قرآن مجید کا مطالعہ انھوں نے انگریزی زبان میں کیا۔ ہندوستانی سیاسیات پر ملکی اور غیر ملکی کتابیں وہ ضرور پڑھتے۔ ۱۹۴۵ء میں ان کی توجہ اورنگ زیب کی زندگی پر مرکوز تھی۔ اسی سال مشہور مغربی شاعروں کا کلام بھی ان کے زیر مطالعہ رہا۔ انھیں فارغ اوقات میں سکے جمع کرنے اور اخبارات کے تراشے الہم میں محفوظ کرنے کا شوق بھی تھا۔

۱۹۱۳ء میں مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ مسلم لیگ میں شامل ہو کر انھوں نے ہندو اور انگریز دونوں کو مات دے دی اور ملک کی آزادی کے لیے انھیں مجبور کر دیا۔ ۱۴- اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان ایک آزاد ملک بن گیا۔ اسی دن انھوں نے گورنر جنرل پاکستان کے عہدے کا حلف اٹھایا۔ ابھی یہ ملک اپنی کم زور ٹانگوں پر کھڑا بھی نہ ہو پایا تھا کہ قائد اعظم ۱۱- ستمبر ۱۹۴۸ء کو اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے۔

پانچ لاکھ

محمد محمود احمد

پورے محلے میں ایک ہی بات ہو رہی تھی کہ اللہ چاہے تو آدمی کو اسی طرح فقیر سے بادشاہ بنا دیتا ہے جیسے سڑکوں پر پتھر کوٹنے والا کرمو بادشاہ بن گیا تھا۔ اس کا ایک، دو نہیں پورے پانچ لاکھ کا انعامی بانڈ نکلا تھا۔ قصہ کچھ یوں تھا کہ شہر سے کافی دور سڑک بن رہی تھی۔ کرمو کو ٹھیکے دار سے ہفتے کی مزدوری لینا تھی۔ اتفاق سے ٹھیکے دار کے پاس نقد پیسے نہیں تھے۔ اس نے کرمو کو مجبوراً بانڈ دے دیا کہ اسے بڑی دوکان پر دے کر سودا سلف خرید لینا۔ کرمو کی بیوی زہرہ بڑی کفایت شعار عورت تھی۔ وہ کرمو سے کہنے لگی: ”تمہارے بڑے بھائی کے پاس صندوق میں بے شمار بانڈ پڑے ہیں۔ رفیق کی بیوی کے اٹیچی کیس میں آٹھ دس بانڈ تو میں نے بھی دیکھے ہیں۔ تمہارے



بھائی نہ تمہیں اُدھار دیتے ہیں، نہ تمہاری مدد کرتے ہیں۔ خود دفاتروں میں بابو ہیں اور تم سڑکوں پر مٹی پھانکتے ہو۔ ہم اس بانڈ کو اپنے پاس رکھ لیتے ہیں۔ ہو سکتا ہے رب ہم سے راضی ہو جائے اور ہمارے دن پھر جائیں۔“

زہرہ نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ اللہ نے واقعی ان کی دعا سن لی تھی۔ ٹھیکے دار کو جب انعام نکلنے کا علم ہوا تو اس نے کرمو سے کہا: ”تمہارے لیے تو یہ بانڈ صرف پانچ لاکھ روپے کا ہے، لیکن ہم جیسے کاروباری لوگوں کے لیے اس کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ ہمارا کافی ٹیکس معاف ہو جاتا ہے۔ تم سیدھے سادے آدمی ہو۔ بینکوں میں دھکے کھانے کے بجائے تم یہ بانڈ مجھے پانچ لاکھ میں دے دو۔“

کرمو بولا: ”بسم اللہ جی! پہلا حق آپ کا ہے، آپ خرید لیں۔“ کرمو ٹھیکے دار کی کوٹھی سے پانچ لاکھ روپے کا تھیلا بھر لایا۔ دوسری صبح کیا دیکھتا ہے کہ اس کے دونوں بڑے بھائی اپنے بیوی بچوں سمیت کرمو کے گھر آئے ہوئے ہیں۔ ان سب کو دیکھتے ہی کرمو کی بیوی زہرہ بولی: ”بھائی جان! آپ اور ہمارے گھر! ہم خواب تو نہیں دیکھ رہے؟ آپ تو عید کے دن بھی ہمارے گھر نہیں آتے!“

زہرہ کی بات سن کر اس کی دیورانی کٹھن بولی: ”رہنے دو بہن! ابھی تو ہم سے ناراض رہتی ہو! لاکھ لاکھ مبارک ہو۔ اللہ نے تینوں بھائیوں کی قسمت کھول دی ہے۔ اب ہم سب ٹھاٹھ سے زندگی گزاریں گے۔“

زہرہ سے رہانہ گیا، بولی: ”کیا؟ کیا؟ ہم سب؟ مگر آپ نے تو پچھلے پندرہ برسوں سے ہماری پانچ روپے کی مدد بھی نہیں کی تھی۔ ہمارے کسی بچے کے ہاتھ پر پانچ پیسے بھی نہیں رکھے۔ آج ہمارے پانچ لاکھ تینوں کے کیسے ہو گئے؟“

کرمو کا بڑا بھائی صدیق بولا: ”چھوڑو، چھوڑو، کیا پرانی باتیں لے بیٹھی ہو۔ بھائی کرم دین! ذرا پانچ لاکھ کی جھلکی تو دکھانا۔ دفتر کو دیر ہو رہی ہے۔“

زہرہ پھر بول اٹھی: ”لو آج کرمو، کرم دین بھی ہو گئے۔ واہ رے پیسہ!“

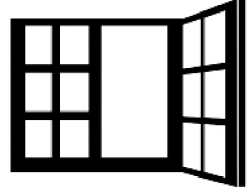
”خاموش، خاموش، خاموش!“ کرمو تین دفعہ چیخا اور سب کو سانپ سوگھ گیا۔ کرمو بولا: ”دیکھو

میں غریب تھا، بھوکا تھا، قرض دار تھا۔ کسی بھائی نے میری مدد نہ کی۔ وجہ کیا تھی، صرف پیسہ۔ پیسہ ہی لوگوں کو خود غرض اور کمینہ بنا دیتا ہے اور میں اپنے بھائیوں کی طرح نہیں ہونا چاہتا۔“

کرمو کی آنکھیں غصے سے لال دکھائی دے رہی تھیں۔ اس نے ہاتھ میں کلہاڑی اٹھاتے ہوئے کہا: ”میں اسی گھر کے صحن میں تم سب کے سامنے پانچ لاکھ روپے جلا رہا ہوں۔ اگر کسی نے مجھے روکایا نوٹوں کے ڈھیر سے کوئی نوٹ اٹھایا تو کلہاڑی سے اس کا قیمہ کر دوں گا۔“

کرمو بھاگ کر کمرے سے نوٹوں کے بنڈل لے آیا۔ وہ اتنے غصے میں تھا کہ کوئی اسے پکڑنے کی جرات نہیں کر رہا تھا۔ پھر کرمو نے ان نوٹوں پر مٹی کا تیل چھڑک کر انھیں آگ لگا دی اور ساتھ ہی کلہاڑی تان کر کھڑا ہو گیا۔ شور سن کر پڑوسین دیواروں سے اور بچے باہر سے جلتے ہوئے نوٹوں کا منظر دیکھ رہے تھے۔ ہر چہرہ پیلا ہو رہا تھا۔ ادھر نوٹ جل گئے اور ادھر کرمو کی بیوی دھڑام سے زمین پر گر گئی۔ کرمو کے بھائی اور دوسرے لوگ بڑاڑتے ہوئے اپنے گھروں کو چل دیے۔ کسی نے اس کی بیوی کی پروا تک نہ کی۔ کرمو کافی دیر کے بعد اپنی بیوی کو ہوش میں لاسکا۔ زہرہ نے ہوش میں آتے ہی کرمو سے منہ پھیر لیا۔ کرمو نے نہایت آہستگی سے اس کے کان میں کہا: ”اری خوش بخت! مجھے باؤلے کتے نے کاٹا ہے کہ میں پانچ لاکھ روپے جلا دوں، وہ تو بچوں کی لالٹی والے نقلی نوٹ تھے جنہیں میں پچاس روپے میں خرید کر لایا تھا۔ اب بتا، اگر وہ پچاس روپے ضائع نہ کرتا تو میرے پانچ لاکھ کیسے بچتے؟ وہ دیکھ بھورا بیگ نوٹوں سے بھرا ہوا ہے۔ اچھا، اب جلدی سے خود بھی تیار ہو جاؤ، بچوں کو بھی تیار کرو۔ ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔“

بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ سب سے اچھی پیسٹریاں اور سال گرہ والے کیک کرم دین بیکرز سے ملتے ہیں اور کرم دین بیکرز کا مالک وہی کرمو ہے، جس کا پانچ لاکھ روپے کا انعام نکلا تھا۔ وہ اپنے سادہ، لیکن خوب صورت مکان میں بہت سکون سے زندگی گزار رہا ہے۔ اس کے خود غرض اور لالچی بھائیوں کو اس جگہ کی ہوا تک نہیں لگی۔



علم درجہ

مسلل اور اچھا مطالعہ حصول علم کا بہترین
ذریعہ ہے۔ مطالعہ کرتے ہوئے کوئی اچھی
بات، کوئی اچھا قول، فکر انگیز مکالمہ، کوئی خوب
صورت خیال نظر سے گزرے تو اسے اپنے
علاوہ دوسروں کے لیے بھی محفوظ کر لیجئے۔ آپ
جانتے ہیں ناں کہ علم کی تقسیم ہی علم کو ضرب
دینے کے مترادف ہے۔ اپنی تحریر حوالہ کے
ساتھ بھیجئے تاکہ اسے مستند سمجھا جائے۔

اپنی اپنی صورت

مہک اکرم، لیاقت آباد

ایک دن ابو جہل، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی
خدمت میں آیا اور کہنے لگا کہ تمام بنو ہاشم میں
آپ کی صورت (نعوذ باللہ) بہت بُری ہے۔
حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تُو نے سچ کہا۔“
اسی دوران حضرت ابو بکر صدیقؓ وہاں تشریف
لائے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نظر
ڈال کر فرمایا: ”یا رسول اللہ! آپ حُسن کے
آسمان ہیں۔“
حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تم نے
بھی سچ کہا۔“
اس وقت جو صحابہ کرامؓ وہاں موجود تھے، انھوں
نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: ”یا رسول

اللہ! آپ نے ابو جہل اور ابو بکرؓ دونوں کو سچا کہہ
دیا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“
حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”میں ایک
صاف شفاف آئینہ ہوں۔ اس میں جیسا کوئی ہوگا
ویسا ہی نظر آئے گا۔“ (یعنی اس آئینے میں ان
دونوں نے اپنی اپنی صورت دیکھی)

چند سنتیں

عبدالرافع، کراچی

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی میں جس
طرح عمل کیا، اسے سنت کہتے ہیں۔ چند سنتیں ایسی
ہیں، جن پر آپ عمل کریں گے تو ان شاء اللہ ثواب
بھی ملے گا اور آپس میں محبت بھی بڑھے گی۔
۱۔ سلام میں پہل کرنا نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی
سنت ہے۔

۲۔ مصافحہ کرنا بھی سنت ہے۔ جب بھی آپ اپنے دوستوں سے ملیں، سلام کرنے کے بعد اُن سے مصافحہ ضرور کریں۔

۳۔ دوسروں سے مسکرا کر ملنا بھی سنتِ رسولؐ ہے۔

۴۔ دوسروں کی دعوت قبول کرنا بھی سنت ہے۔

۵۔ ہر جائز کام سے پہلے بسم اللہ پڑھنا سنت ہے۔

۶۔ کھانے میں عیب نہیں نکالنے چاہئیں۔ یہ سنت کے خلاف ہے۔

میرے وطن

شاعر: قتیل شفائی

پسند: اُمید اہلبیاریان، نارتھ کراچی

اے میرے وطن تیری فضا کتنی بھلی ہے
جنت سے بھی پیاری تری ایک ایک گلی ہے
مٹ سکتی نہیں تیرے دروہام کی رونق
تعمیر تری نور کے سانچے میں ڈھلی ہے
کیا اس کو ڈرائے گا یہ سفاک زمانے
وہ قوم جو تلوار کے سائے میں پٹی ہے
جب آگ میں ڈالو اسے، بن جاتی ہے کندن
اس قوم کی ہمت ہے کہ سونے کی ڈلی ہے
ہم نکلے ہیں بن کر تیری عظمت کے محافظ
جو شخص ہے تصویرِ حسینؑ ابنِ علیؑ ہے

نرمی سے

انعام منصور، لیاقت آباد

ایک مرتبہ آنکھوں نے زبان سے پوچھا: ”تجھ کو ہر طرف دشمن گھیرے ہوئے ہیں۔ دانتوں کی چھری ہر وقت تجھ پر تیز رہتی ہے۔ تو اپنا بچاؤ کس طرح کرتی ہے؟“
زبان نے کہا: ”نرمی سے۔“

امانت و دیانت

محمد حبیب عباسی، پرانا سکھر

حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ کے دور میں ایک بار بیت المال میں سیب آئے۔ آپؓ مسلمانوں کو سیب تقسیم فرما رہے تھے کہ ان کا بیٹا قریب آ گیا اور سیب اٹھانے لگا۔ آپؓ نے سیب اٹھانے سے روک دیا۔ بیٹے نے ماں سے جا کر شکایت کی۔ ماں کی متاجوش میں آئی۔ ماں نے بیٹے کے لیے بازار سے سیب منگوادے۔
حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ گھر آئے تو سیب کی خوشبو محسوس کی۔ آپؓ نے پوچھا: ”سرکاری سیب تو نہیں آئے؟“

اہلیہ نے پورا واقعہ بتا دیا۔ اس پر آپؓ کہنے

لگے: ”اللہ کی قسم میں نے اس کے منہ سے نہیں اپنے دل سے چھینا تھا۔ مجھے پسند نہ تھا کہ مسلمانوں کا حق مارنے کے سبب خود کو اللہ کے حضور برباد کروں۔“

شخصیت پرستی

علیہ السلام، رحیم یار خان

مسلم لیگ بمبئی کے چند ارکان قائد اعظم کو کسی جلے کی دعوت دینے گئے۔ ان میں سے ایک شخص نے مصافحہ کرتے ہوئے ان کا ہاتھ چوم لیا۔ قائد اعظم نے فوراً ہاتھ کھینچ لیا اور کہا: ”لوگوں کو چاہیے کہ مجھے عام آدمی تصور کریں۔ اس طرح کی حرکتوں سے قوموں کو غلط طریقوں سے سر جھکانے کی عادت پڑ جاتی ہے۔ اسی کو شخصیت پرستی کہتے ہیں۔ یہ مرض بہت مہلک ہوتا ہے۔“

کمپیوٹر

شاعرہ: ثروت سلطانہ ثروت

پسند: سعد محمود، حیدر آباد

آیا ہے کمپیوٹر کا دور
وقت نے رنگ دکھائے اور
لمحے بھر میں آئے ہاتھ

بھولی ببری معلومات
دور جو کوئی بیٹھا ہے
سامنے اب وہی بیٹھا ہے
حیرت کی ایجاد ہے یہ
سائنسی استاد ہے یہ
دل اب کمپیوٹر سے لگاؤ
اپنے کام آسان بناؤ
سب نے ہی اس کو مانا
تم پیچھے مت رہ جانا

اقوال زریں

ابن فاطمہ، پتانا معلوم

☆ بھول جاؤ انھیں، جنھیں معاف نہیں کر سکتے
اور معاف کر دو انھیں، جنھیں بھول نہیں سکتے۔
☆ جیسے ہو ویسے ہی دکھائی دویا پھر جیسے نظر آتے
ہو ویسے ہی بن جاؤ۔
☆ جو پسند ہے اسے حاصل کر لویا پھر جو حاصل
ہے اسے پسند کر لو۔

مقناطیس کیا ہوتا ہے؟

شاہ زیب اعجاز پھل، پھل شہر

مقناطیس میں ایک طرح کی برقی قوت ہوتی ہے

مالکن اور نوکرانی

رشنا جمال الدین شیخ، کراچی

ایک امیر بیوہ بہت مہربان اور ملنسار تھی۔ خاص و عام سبھی سے اچھا سلوک کرتی تھی۔ ایک دن بیوہ کی نوکرانی نے سوچا کہ میری مالکن سبھی سے اچھا سلوک کرتی ہے۔ وہ فطری طور پر اچھی ہے یا ماحول نے اسے اچھا بنا دیا ہے۔ یہ جاننا چاہیے! اگلے دن نوکرانی خاصی دیر سے سو کر اُٹھی مالکن بہت ناراض تھی اور اس نے نوکرانی کو ڈانٹا تو وہ بولی: ”اگر میں ایک دن سست ہو گئی تو آپ کو بے صبر نہیں ہونا چاہیے۔“ مالکن خاموش ہو گئی۔ دوسرے دن پھر نوکرانی دیر سے اُٹھی۔ اب مالکن کو اتنا غصہ آیا کہ اس نے لڑکی کو پیٹ ڈالا۔ کئی انسان مالکن کی طرح ہوتے ہیں وہ جب تک اپنے ماحول سے مطمئن رہیں، مہربان منکسر مزاج اور پُر سکون رہتے ہیں، لیکن کوئی خلاف مزاج بات ہو جائے تو غصے میں آ جاتے ہیں۔ اچھا انسان وہی ہے جو ناخوشگوار لمحوں میں بھی پُر سکون رہے اور اپنے مزاج کو قافلوں میں رکھے۔

اور یہی قوت لوہے، فولاد، نکل وغیرہ کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مقناطیس سب سے پہلے یونان میں مقنیشیا کے مقام پر دریافت کیا گیا تھا اور اسی وجہ سے اس کا نام مقناطیس پڑ گیا۔ مقناطیس کے لمبے ٹکڑے میں جسے ”بار میگنٹ“ کہا جاتا ہے۔ قوت کشش دونوں کناروں پر ہوتی ہے۔ ان میں سے ایک کو شمالی کنارہ اور دوسرے کو جنوبی کنارہ کہتے ہیں۔ یہ دونوں ایک دوسرے کو کھینچتے ہیں۔ اگر مقناطیس کا شمالی کنارہ دوسرے مقناطیس کے جنوبی کنارے کے پاس رکھے جائیں تو وہ ایک دوسرے کے ساتھ چٹ جائیں گے، لیکن اگر دو شمالی کنارے ایک دوسرے کے پاس رکھے جائیں تو وہ ایک دوسرے سے دور ہٹ جائیں گے۔ ہماری زمین بھی مقناطیسی قوت رکھتی ہے۔ اگر ایک سیدھے لمبے مقناطیس کے بیچ میں دھاگا باندھ کر اسے اٹھایا جائے تو مقناطیس کا شمالی کنارہ زمین کی شمالی سمت اور جنوبی کنارہ زمین کی جنوبی سمت گھوم جائے گا۔ قطب نما میں بھی یہی اصول کام کرتا ہے۔

اُن دیکھی رَو

مسعود احمد برکاتی



جب دو آدمی ملتے ہیں۔ سلام دعا ہوتی ہے۔ ہاتھ ملاتے ہیں۔ گلے لگتے ہیں تو اُن میں محبت، خوشی اور خلوص کی ایک رَو پیدا ہوتی ہے۔ دراصل یہی رَو اُن کو پاس لائی تھی۔ اسی رَو نے اُن کو ملایا۔ اسی رَو نے ان کو خوش کیا۔ ان میں اُنس پیدا کیا۔ دراصل یہی رَو ان کے چہروں پر شادابی اور ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ لائی۔ جب وہ جُدا ہونے لگے تو دوبارہ ملنے کی خواہش بھی اسی رَو نے پیدا کی۔ ایک سے دو آدمی ہوئے تو ایک ادارہ بن گیا۔ یہی ادارہ پھیلا تو معاشرہ بن گیا۔ معاشرے میں جتنے لوگ بھی ہوں، وہ ایک اُن کہے وعدے یا معاہدے کی بنیاد پر متحد ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کے کام آتے ہیں۔ ایک دوسرے کے غم اور خوشی میں شریک ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے سے

لین دین کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کے مہمان بنتے ہیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ سفر کرتے ہیں۔ ایک دوسرے سے رشتے جوڑتے ہیں، مگر یہ سب کیسے ہوتا ہے! یہ سب اسی اُن دیکھی رُو کی وجہ سے ہوتا ہے۔ یہی رُو اُن کے درمیان دوڑتی رہتی ہے۔ یہی رُو اُن کو کھینچتی رہتی ہے۔ جب وہ دور ہو جاتے ہیں تو یہی رُو اُن کو پھر ملاتی ہے۔

کوئی عمارت بنانی ہو تو اس کے لیے مٹی، پتھر، اینٹ، چونا، سیمنٹ، ریت اور مختلف قسم کے مسالے اور سامان کی ضرورت ہوتی ہے۔ معاشرہ بھی ایک عمارت ہے۔ اس عمارت کے لیے اعتبار، اعتماد، انصاف، احترام، ایثار، ایمان داری، ہمدردی، تعاون، سچائی اور خوش مزاجی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان چیزوں کے بغیر کوئی دوا آدمی بھی مل کر نہیں رہ سکتے۔ جب دوا آدمی نہیں رہ سکتے تو ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں آدمی کیسے رہیں گے۔ اگر آپ کسی پر اعتبار نہیں کر سکتے اور وہ بھی آپ پر اعتماد نہیں کر سکتا تو لین دین کیسے ہوگا۔

ایک آدمی دوسرے کی عزت نہیں کرے گا تو دوسرا بھی اس کی عزت نہیں کرے گا۔ بے عزت آدمی کیا کام کر سکتے ہیں۔ اگر انصاف نہ ہو تو انسان بد دل ہو جاتا ہے۔ بد دل آدمی بھی کام نہیں کر پاتا۔ جب کسی بات کے سچ ہونے کا یقین نہ ہو تو اطمینان کیسے حاصل ہو۔ جب دوا آدمی آپس میں خوش ہو کر نہ ملیں تو زندگی کا کیا مزہ اور اس طرح آہستہ آہستہ لوگ آپس میں ایک دوسرے سے بدظن اور بدگمان ہونے لگتے ہیں اور معاشرہ بکھرنے لگتا ہے۔ امن، راحت، خوشی اور خوش حالی نہیں رہتی۔ اس لیے انسان کی بھلائی کے لیے اچھا معاشرہ ضروری ہے اور اعتبار، اعتماد، انصاف، احترام، ایثار، ایمان داری، ہمدردی، تعاون، سچائی اور خوش مزاجی کے بغیر معاشرہ قائم نہیں رہ سکتا۔ ان سب چیزوں کے بجائے اگر ہم صرف ایک لفظ کہنا چاہیں تو وہ ہے ”اخلاق“ اور یہی وہ اُن دیکھی رُو ہے جو انسان کے ہر کام میں جاری و ساری رہنی چاہیے۔ جن کاموں میں یہ اُن دیکھی رُو نہ ہو تو اُن کاموں کو انسان کی بھلائی کے کام نہیں کہا جاسکتا۔



شین شرارت

طنز و مزاح کے اس سلسلے میں لطائف، مزاحیہ واقعات،
مزاحیہ اشعار، دلچسپ کارٹون یا تصاویر بھی بھجوائی جاسکتی ہیں

دو کارباری حضرات گفتگو کر رہے
تھے۔ ایک نے کہا: ”تمہیں معلوم
ہے کہ اشتہار کا نتیجہ کتنی جلدی ظاہر
ہو جاتا ہے۔“

دوسرے نے جواب دیا: ”ہاں،
معلوم ہے۔ پرسوں میں نے گھر کے
لیے چوکیدار کا اشتہار دیا تھا، کل
ہمارے ہاں چوری ہو گئی۔“

خدیجہ صد، دہلی



ڈاکٹر نے نسخہ لکھتے ہوئے مریض کو
یقین دلایا: ”اب وہ فوراً ٹھیک
ہو جائے گا۔“

ڈاکٹر نے غلط نہیں کہا تھا۔ میڈیکل
اسٹور سے نسخے کی قیمت معلوم کرتے
ہی مریض فوراً ٹھیک ہو گیا۔

عبدالرافع، لیاقت آباد

کھلاڑی ریس میں دوڑ
رہے تھے۔ ریس دیکھتے
ہوئے ایک دیہاتی نے پاس
کھڑے ہوئے آدمی سے
پوچھا: ”کون جیتے گا؟“

”سب سے آگے والا۔“
آدمی نے جواب دیا۔

دیہاتی نے کہا: ”پھر بچھڑے والے
کیوں بھاگ رہے ہیں؟“

ابن فاطمہ محمد شاہد، ہیر پور خاص

1980



2019





”شیریں“ زبان اور ”تھکیل“، ”شکل و شباہت“ کے باوجود کبھی کبھی اس کی شیطانیت اور ”شراغیزی“ سے لوگ ”ششدرہ“ رہ جاتے ہیں اور ”تھک و شباہت“ کے ساتھ ”شش و پنج“ میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

حریم خان، الہمرا

بیوی: ”آٹا کہاں سے لائے تھے؟“
شوہر: ”کیوں؟ کیا ہوا؟“
بیوی: ”ساری روٹیاں جل گئیں۔“

تبیخہ تھکیل احمد، سانگھڑ

فائرنگ کے دوران ایک شخص ماتھے پر گولی لگنے سے ہلاک ہو گیا۔ لاش گھر پہنچی تو رشتے داروں

”ش“ اردو ابجد کا انیسواں حرف ہے جو اپنی ”شرارت“ اور ”شوخی“ کی وجہ سے مشہور ہے۔ یہ ”شہنشاہ“ کی طرح ”شان و شوکت“ سے ”شیش محل“ میں رہتا ہے۔ ”شریر“ ہونے کے باوجود یہ انتہائی ”شریف“، ”شفیق“ اور ”شرمیلہ“ بھی ہے۔ ”خطرِ نج“ کا ”شائق“ ہے۔ ”شاعری“ سے اس کو ”شغف“ ہے۔ مزاج میں ”تھگفتگی“ اور ”شادابی“ کی وجہ سے ”شہر“ میں اس کے ”شناساؤں“ اور ”شیدائیوں“ کا ”شمار“ مشکل ہے۔ ”شمشیر زنی“ میں ماہر۔ ”شیر“ کی طرح نڈر ہونے کے باوجود یہ پھول کی طرح ”شاداب“ ہے۔

اکبر الہ آبادی نے ایک دفعہ شاعری کے
بڑھتے ہوئے شوق کو دیکھ کر کہا:

بڑھ رہا قوم کے بچوں میں شوق شاعری
جس طرح سے شاعری ہر فرد پر اک فرض ہو
رہی یہی حالت تو مولود پیدائش کے بعد
سانس لیتے ہی پکارے گا، مطلع عرض ہے۔

ایمن شاہد، میرپور خاص

عورت اپنے شوہر کی قبر پر روتے ہوئے
بولی: ”چھوٹا بیٹا اسکول کے نئے جوتے مانگ
رہا ہے۔ بیٹی نے موبائل فون کی فرمائش کردی
ہے۔ خود میرے اپنے کپڑے پرانے ہو گئے
ہیں، کیا کروں میں؟“
قبر سے گھٹی گھٹی آواز آئی: ”میں مر گیا ہوں،
سعود یہ نہیں گیا ہوں۔“

اُم ایما نکیل احمد، ساکھڑ

میں سے ایک بڑی بی نے کہا: ”بڑی خیر ہوئی،
آنکھ بال بال بچ گئی۔“

آمینہ کونین، بلدیہ ٹاؤن

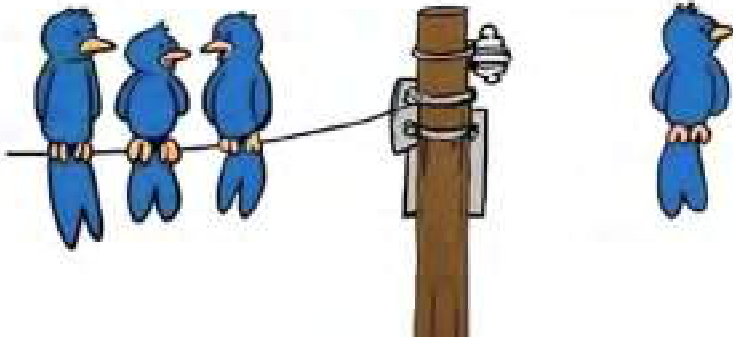
ماں: ”اگر تم میرے کہنے پر عمل نہیں کرو گے تو
میں تمہیں سخت سزا دوں گی۔“
بیٹا: ”کون سی سزا دیں گی؟“
ماں: ”میں تمہیں کرکٹ کا کھلاڑی بنا دوں گی
پھر تم ساری عمر دھوپ میں جلتے رہو گے۔“

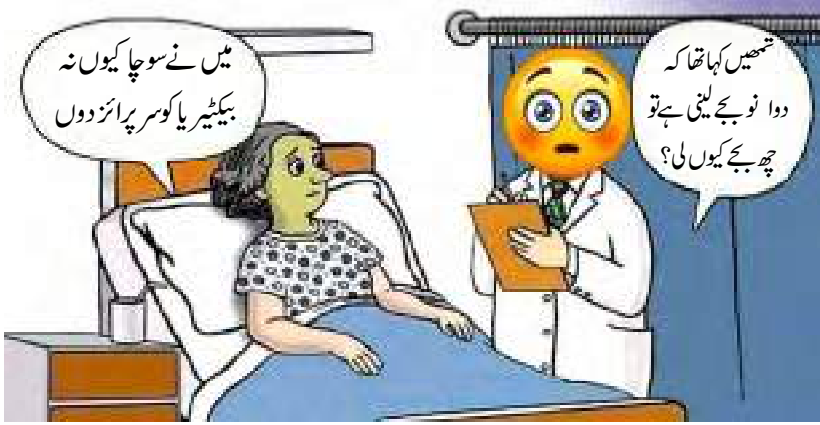
حافظ محمد اسلم، کراچی

ماں اپنے بیٹے سے: ”تُو اپنے بال کیوں نہیں
کٹواتا؟“
بیٹا: ”ماں! لمبے بال رکھنا فیشن ہے۔“
ماں: ”وہ تو ٹھیک ہے پر لوگ تیری بہن کو دیکھنے
آتے اور تجھے پسند کر کے چلے جاتے ہیں۔“

جویریہ فاطمہ، حیدر آباد

حیران نہ ہو! اُس کے پاس دائی فائی ہے





افسرتھا۔ سوال کرنے والا شخص بہت حیران ہوا اور بولا: ”آپ تعلیم یافتہ تو نہیں ہیں۔ آپ وہاں ریسرچ افسر کیسے ہو گئے؟“ وہ صاحب بولے: ”میں دراصل آلوؤں پر ریسرچ کرتا تھا۔“ اس شخص نے پھر پوچھا کہ جناب وہ کیسے؟ آلوؤں پر ریسرچ کرنے کے لیے تو ایگریکلچرل ڈگری کا ہونا ضروری ہے۔

یہ سن کر لندن پلٹ صاحب نے جواب دیا: ”بات یہ ہے کہ وہاں پر سبزی کی ایک دکان تھی اور میں وہاں بڑے آلو چھانٹ چھانٹ کر ایک ٹوکری میں اور چھوٹے آلو دوسری ٹوکری میں رکھا کرتا تھا۔“

اربیہ افروز، نارتھ ناظم آباد

کرکٹ ٹیسٹ میچ ہو رہا تھا۔ اسٹیڈیم کے گیٹ پر ایک لڑکا پاس دکھا کر اندر جانے لگا تو گیٹ کیپر نے کہا: ”یہ تمہارا پاس تو نہیں ہے۔“ ”یہ میرے والد کا ہے۔“ لڑکے نے جواب دیا۔ ”وہ کیوں نہیں آئے؟“ پوچھا گیا۔ ”وہ مصروف ہیں۔“ لڑکا بولا۔ ”کیا کر رہے ہیں وہ؟“ گیٹ کیپر نے پوچھا۔ ”اپنا پاس تلاش کر رہے ہیں۔“ لڑکے نے جواب دیا۔

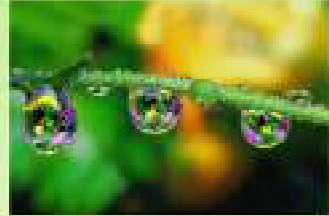
سیدہ ماہم، کراچی

ایک لندن پلٹ صاحب سے پوچھا گیا کہ صاحب آپ لندن میں کیا کرتے تھے؟ موصوف نے جواب دیا کہ میں وہاں ریسرچ

پانی کا قطرہ

تنویر انجم

سردی سے جم کر
ٹھہرا ہوا تھا
گرمی سے پگھلا
چوٹی سے پھسلا
دریا میں اُترا
دیکھو رے دیکھو
بہتا ہے پانی
چلتا ہے پانی
دریا میں بہتا
پانی کا قطرہ
آیا سمندر
کے زیر و بم میں
سورج نے آ کے
قطرے کو پکڑا
بادل میں رکھا
بادل میں رکھ کر
بارش بنایا
بارش کا دھارا
ہم پہ جو برسنا
کیا لطف آیا
جگ مسکرایا



Press Ad

Page 38

ہیرا پھیری

عشرت جہاں



چور چوری سے جائے ہیرا پھیری سے نہ جائے۔ یہ مثل بابر بھائی پر صادق آتی تھی۔ کہیں بیٹھے ہوں عادت سے مجبور ہو کر کچھ نہ کچھ اٹھا ضرور لیتے تھے۔ محلے کے ایک درزی کے پاس بیٹھنے لگے تو بٹن دھاگے اور سوئیاں غائب کرنا شروع کر دیں۔ گھر لالا کر جمع کرنے لگے۔ انور درزی کو پتا چلا تو پرانی تعلق داری کا لحاظ کرتے ہوئے کہا تو کچھ نہیں، لیکن دوکان سے فارغ کر دیا۔ پھر کسی کارخانے میں کام کرنے لگے، چند دن محتاط رہے۔



خود کو بہ مشکل تمام رو کے رکھا، مگر بل آخر ہاتھ کی صفائی دکھانے لگے۔ پہلے کپڑوں کے چھوٹے ٹکڑے پھر بڑے ٹکڑوں پر ہاتھ صاف کرنے لگے۔ بیوی نے ہر چند منع کیا: ”کیوں نیک کمائی کو خراب کرنے کے کام کر رہے ہو؟“

اچھی بھلی روزی سے جاؤ گے، مالکوں کو پتا چلا تو نکالنے میں دیر نہیں لگائیں گے۔“ بیوی نے بار بار سمجھایا۔

”امیر کبیر سیٹھ لوگ ہیں، یہ لوگ چھوٹے دل کے نہیں ہوتے بھلا انھیں معمولی باتوں کی کیا پروا، یوں بھی چھوٹے موٹے کپڑوں سے کیا بنتا ہے بھلا؟“ وہ لاپرواہی سے بولے۔

”اگر کچھ نہیں بنتا تو چھوڑ کیوں نہیں دیتے یہ حرکتیں۔“ بیوی زور سے بولی۔

ان سے جواب نہ بن پڑا تو باہر کی راہ لی اور پھر ایسا ہی ہوا کہ ایک دن فیکٹری سے بھی نکال دیے گئے۔ کئی دن بے روزگار پھرتے رہے۔ آخر دور پار کے ایک رشتے دار کو رحم آیا اور کسی کینٹین میں کام پر لگوا دیا۔ بابر بھائی قصہ گوئی میں ماہر تھے۔ سب کا دل لگائے رکھتے خود ان کا بھی اس کام میں دل لگ گیا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ شام میں جو کھانا بیچ جاتا اکرم بھائی تمام ملازمین میں برابر تقسیم کر دیتے۔ کسی دن بریانی، کبھی پائے نہاری تو کبھی تورمہ۔ کسی دن کھانا زیادہ مل جاتا تو کسی دن کم۔ چند دن تو بابر بھائی قناعت پر قائم رہے، لیکن کب تک؟ کہتے ہیں کہ انسان شکل بھی بدل سکتا ہے، مگر عادت نہیں۔ چوری اور ہیرا پھیری کی بُری لت انھیں اس طرح چسٹ چکی تھی کہ اسے وہ غلط بات سمجھتے ہی نہیں تھے۔ جب کھانا بن کر تیار ہو جاتا تو وہ اپنے لیے پہلے سے ہی نکال کر ایک طرف رکھنے لگے۔ اب چاہے کم ہو یا زیادہ ان کی بلا سے۔ انھیں تو اپنے حصے سے غرض تھی۔ آہستہ آہستہ گھی مریج مسالحوں میں بھی ڈنڈی مارنے لگے۔

اکرم بھائی کو پہلے تو شک ہوا۔ بہ نظر غائر انھوں نے سب کا جائزہ لیا اور آخر کار بابر بھائی پر ان کا یقین پختہ ہو گیا۔ یہاں بھی لحاظ، مروت آڑے آیا، اکرم بھائی چاہتے تو رنگے ہاتھوں پکڑ کر ذلیل کر سکتے تھے، لیکن انھیں سبق سکھانے کے لیے انھوں نے انوکھا طریقہ اختیار کیا۔

”ہاں بھئی، عمران بیٹا! بابر بھائی کے لیے ذرا اگر ماگرم بریانی تو لے آؤ۔“ بابر بھائی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر انھوں نے قریب بٹھالیا۔

”حمزہ بیٹا! سلا داور راستہ بھی لے آؤ۔“ بابر بھائی حیران حیران سے بیٹھے تھے۔ اگرچہ اکرم بھائی

کا رویہ تمام ملازمین کے ساتھ اچھا تھا، لیکن آج وہ ان پر خصوصی مہربان تھے۔ ایک پلیٹ بریانی انھوں نے اکرم بھائی کے اصرار پر جھجکتے جھجکتے ختم کی، پلیٹ صاف کر کے رکھ ہی رہے تھے کہ دوسری پلیٹ سامنے دھردی۔

”بابر صاحب! اور کھائیں۔“ اکرم بھائی نے خوش دلی سے کہا۔

”الحمد للہ، پیٹ بھر گیا ہے اکرم بھائی!“ بابر بھائی نے پیٹ پر ہاتھ مار کر ڈکار لی۔

”نہیں جناب! یہ کھانا تو آپ کو کھانا ہی پڑے گا۔ اس پر آپ ہی کا نام لکھا ہے۔“ اکرم بھائی کے انداز پر وہ چونکے۔ دوسری پلیٹ بڑی مشکل سے ختم کی جو مقدار میں بھی زیادہ تھی۔ لڑکے کن آنکھوں سے بابر بھائی کو دیکھ رہے تھے۔

”پانی۔“ انھوں نے پانی مانگا۔

”پانی نہیں آج صرف کھانا ملے گا۔“ اکرم بھائی کے ہونٹوں سے مسکراہٹ غائب ہو چکی تھی۔

عمران تیسری پلیٹ لیے سر پر کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر شرارت ناچ رہی تھی۔

”نن..... نہیں..... اکرم بھائی! اب گنجائش نہیں ہے۔“ بابر بھائی ہکلائے۔

”آپ کو کھانا پڑے گا بابر بھائی!“ اکرم بھائی نے دیدے گھمائے۔

”خدا قسم صرف ایک پلیٹ کی گنجائش تھی آپ کے کہنے پر دوسری بھی کھا چکا، مگر اب.....“ دھان

پان سے بابر بھائی رو دینے کو تھے۔

”اللہ کے بندے! جب انسان کی ضرورت محدود ہے وہ لالچ کیوں کرتا ہے۔ کیوں اپنا اعتبار ختم

کرتا ہے۔“ اکرم بھائی تیزی سے بولے۔

”میری توبہ۔ مجھے معاف کر دیں اکرم بھائی!“ انھوں نے فوراً کانوں کو ہاتھ لگائے، اگر آئندہ

ایسی حرکت کروں تو جو چور کی سزا وہ میری سزا۔“

ان کی بات سن کر لڑکے ہنسنے لگے۔ ان کے انداز پر اکرم بھائی بھی مسکرا دیے۔

نونہال مصور



سلمان یوسف سمیچہ، علی پور



رُبانندیم، کراچی



مضور ریاض، کراچی



عودان خان، میرپور خاص



شیخ محمد معاویہ، کراچی



مدحت فاطمہ اتیاز، کراچی



طوبی فاروق حسین شیخ، شکارپور



محمد ایان خان، میرپور خاص



ارسلان، کوٹری



جویریہ، کوٹری

Press Ad

Page 44

مرے قائد اعظم

شمس القمر عاکف

من کا اُجلا ، وفا کا پیکر تھا
علم کے نور سے منور تھا
وہ عمل میں سبھی سے بڑھ کر تھا
ایک منزل شناس رہبر تھا
میرے قائد سا اور کوئی نہیں
میرے قائد سا اور کوئی نہیں

جو بھی کہتا تھا ، کر دکھاتا تھا
قول کو وہ عمل بناتا تھا
ہر رکاوٹ کو توڑ جاتا تھا
ہر مصیبت کا حل بتاتا تھا
میرے قائد سا اور کوئی نہیں
میرے قائد سا اور کوئی نہیں

اب بھی دنیا مثال ڈھونڈتی ہے
خلق وہ باکمال ڈھونڈتی ہے
رب سے کر کے سوال ، ڈھونڈتی ہے
ہو گئے کتنے سال ، ڈھونڈتی ہے
میرے قائد سا اور کوئی نہیں
میرے قائد سا اور کوئی نہیں



تخلیق ہے یا اختراع - جو بھی ہے کمال ہے



سان فرانسسکو کا ایک یادگار دن اسٹیو جابز کے نام

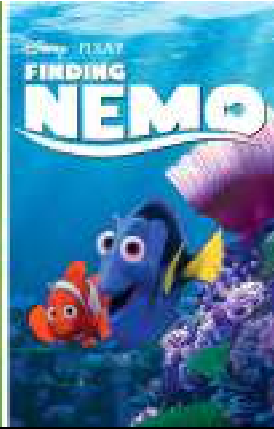
میں اسٹیون پال جابز کے آبائی شہر سان فرانسسکو میں موجود ہوں۔ اس کا اپنا قصبہ Palo Alto یہاں سے کوئی ۴۵ منٹ کے فاصلے پہ ہے۔ میں اسٹیو کے گوٹھ تک تو نہ جا سکا البتہ میں نے جابز کے معروف ادارے اپیل کمپیوٹرز تک ضرور رسائی حاصل کر لی۔ اس ادارے کی خوب صورت دائرہ نما عمارت میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ Cupertino نامی یہ جگہ سان فرانسسکو سے کچھ ہی دور واقع ہے۔ میں اسٹیو جابز کو خراج تحسین پیش کرنے یہاں آیا ہوں۔ اس شخص سے اظہار



عقیدت کرنا چاہتا ہوں جس کی زندگی تخلیق، اختراع اور ایجادات کے حوالے سے جدوجہد کرتے ہوئے گذری اور اس جدوجہد کے نتیجے میں عظیم الشان کامیابیوں نے اس کے قدم چومے۔ کمال شخص تھا جس کی شہر بار کوششوں نے آئی ٹی کے میدانوں میں حیرتوں کے نئے درکھول دیئے۔ امریکن انٹرپرائز (کاروباری)، اپیل کمپیوٹرز کا چیئرمین اور چیف ایگزیکٹو، دنیا کی سب سے بڑی اینی میشن کمپنی Pixer کا CEO، صنعت کار، سرمایہ دار، ڈیزائنر۔

اسٹیو جابز نے نہ صرف اپیل کمپیوٹرز کے حوالے سے غیر معمولی شہرت پائی بلکہ آئی فون کے حوالے سے بھی دنیا بھر میں اپنے نام اور کام کی دھاک بٹھائی۔ اسٹیو جابز کے عالمی برانڈ اپیل کو پراہلم فری کمپیوٹر سسٹم کہا جاتا ہے اور کچھ ایسا غلط بھی نہیں کہا جاتا۔ وائرس اور ہینگ ہونے کے دکھ درد سے بالکل آزاد، نہایت پائیدار، بہت خوب صورت اور قابل اعتماد سسٹم جسے پیشہ ورانہ کاموں کے لیے دنیا کا سب سے بہترین کمپیوٹر قرار دیا گیا۔





اسٹیو جاز کے ادارے پکسر کی بنائی ہوئی تین عالمی شہرت یافتہ ایٹمی میشن فلمیں

اپیل دیکھتے ہی دیکھتے پہلے امریکہ اور پھر دنیا بھر میں سماجی مرتبے کی علامت بن گیا اور صورت حال یہاں تک جا پہنچی کہ دنیا کے تمام بڑے تجارتی اداروں میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جس کا کاروبار اپیل کے بغیر مکمل سمجھا جاتا ہو۔

ایسی ہی کچھ صورت آئی فون کی بھی تھی۔ جنوری 2007 میں جب ماسکون سینٹر میں کھڑے ہوئے پال جاز نے میڈیا اور آئی ٹی پروفیشنلز کو بتایا کہ اب آپ کو انٹرنیٹ کا مکمل استعمال اس ایک فون کے اندر ملے گا اور اس کا ٹچ سسٹم آپ کو حیران کر دے گا۔ سمارٹ فون کے بارے میں سن کر لوگ حیرت زدہ رہ گئے مگر سب کو یقین تھا کہ یہ شخص جو کہہ رہا ہے وہ غلط نہ ہوگا۔ اس کا کہا ہوا سچ ثابت ہوا اور یوں اپیل کے چرچے ایک بار پھر زبانون پر عام ہو گئے۔

محدود مدت میں اپیل آئی فون کمپنی امریکہ کی بڑی کمپنیوں کے برابر آکھڑی ہوئی۔ اپیل کے کمپیوٹرز ہوں یا آئی فون اپنی کارکردگی، پائیداری اور ظاہری و باطنی خوب صورتی میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا شاید اسی لیے اپیل سماجی مرتبے کی علامت بن گیا۔

اسٹیو جاز بہ یک وقت موجد بھی تھا، ڈیزائنر بھی، کمپنی کا شریک بانی بھی اور چیف ایگزیکٹو بھی۔ اپنی شخصیت کے حوالے سے نہایت مست ملنگ، اس کی شان بے نیازی کو اس کے لباس کی سادگی سے محسوس کیا جاسکتا ہے۔ ایک ہلکی پھلکی سیاہ رنگ کی شرٹ اور ایک جینز کی پینٹ اس کے تن پہ رہتی جبکہ ایسا ہی ایک جوڑا اس کے وارڈروب میں لٹکا رہتا۔ زندگی کو مقصد بنانے والے اور اپنے مقصد سے عشق کرنے والے لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اپنی ذات سے بے نیاز اور ہمیشہ دوسروں کے لیے فکر مند۔

آپ اسٹیو جاز کے بارے میں پڑھیں گے تو آپ پر حیرتوں کے درکھلتے چلے جائیں گے۔ گود لیا ہوا یہ بچہ جب بڑا ہوا تو تعلیم کے حوالے سے اس کا رویہ کافی غیر سنجیدہ تھا۔ اپنے کالج اکثر نہ جاتا، صرف پسندیدہ کلاسیں لیا کرتا۔ غالباً بہت جلد اپنے اساتذہ کو اپنے معیار کی کسوٹی پہ پرکھ لیتا یا پھر پسندیدہ مضامین ہی میں دلچسپی لیتا۔ بلآخر ۱۸ ماہ بعد کالج بھی چھوڑ دیا۔

اپنی کمپنی کو کامیابی سے چلایا مگر خود اپنی ہی کمپنی سے نکال بھی دیا گیا۔ پھر جب کمپنی کا دیوالیہ ہونے لگا تو بورڈ نے اس کی منت سماجت کی اور اسے واپس بلا لیا۔ واپس آیا تو کمپنی ایک بار پھر اوپر کی جانب اٹھنے لگی۔ کیا آپ کو یقین آئے گا کہ اتنا کامیاب شخص کیسا ضدی اور غصیلہ بھی ہو سکتا ہے۔ اس کے طرز عمل کی وجہ سے اکثر ملازمین اس کی کمپنی کو چھوڑ کر بھاگ جاتے مگر اس کا ادارہ کامیابی کی جانب گامزن رہتا۔

۱۹۹۳ میں اسے امریکہ کا toughest boss قرار دیا گیا یعنی مشکل ترین سیٹھ۔ یوں بھی کامیاب لوگوں کی کوئی ایک کل تو ٹیڑھی ہوتی ہی ہے۔

نوناہل قارئین کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ دنیا کی مشہور اینی میشن فلمیں Toy story، Nemo اور A Bug's life اسٹیو جاز کی کمپنی Pixar میں بنیں اور اسٹیو جاز کی

نگرانی میں بنیں۔ ان فلموں نے بچوں کی دنیا میں دھوم مچا دی۔

اسٹیو جاز خوب صورتی کا دل دادہ تھا۔ اپنی بنائی ہوئی ہر چیز خوب صورت بلکہ خوب صورت ترین دیکھنا چاہتا تھا۔ خوب صورتی کے جنون کا اندازہ کیجیے کہ جب بستر مرگ پہ ہسپتال کی جانب سے اسے گیس ماسک دیا گیا تو اس نے یہ کہہ کر لینے سے انکار کر دیا کہ یہ خوب صورت نہیں ہے۔ اس کے بعد اسے پانچ آکسیجن ماسک دیے گئے، اسے کوئی پسند نہ آیا۔ مرتا مر گیا مگر ظالم نے حسن کے معیار پر کوئی سمجھوتا نہیں کیا۔ جان دیتے ہوئے تین بار ایک ہی آواز نکالی اور چلا گیا۔

oh woo oh woo oh woo

کیسے ممکن تھا کہ میں سان فرانسسکو جاؤں اور اسٹیو جاز کے آستانے پہ سلامی نہ دوں۔ میرے لیے تو اسٹیو جاز پیر و مرشد کا درجہ رکھتا ہے۔ وہ سب لوگ جو اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ دماغ کو استعمال میں لاتے ہیں، دنیاؤں کو تسخیر کرتے ہیں اور دوسروں کی زندگی میں آسانیاں لانے کے لیے کوشاں رہتے ہیں، وہ یقیناً میرے لیے قابل احترام ہیں۔ امریکہ میں چادر چڑھانے کا رواج نہیں ورنہ اسٹیو جاز کے لیے میں یہ بھی کر گذرتا۔ میں نے رمیسا کے ساتھ اچھا خاصہ وقت اپیل کی عمارت میں گزارا۔ اس کی تصویر کو دیر تک عقیدت اور محبت سے دیکھا، نگاہوں نگاہوں میں بہت سی باتیں بھی کیں اور اپنی عقیدت کا نذرانہ پیش کر کے چلا آیا۔

اسٹیون پال جاز اور میں چند دنوں کے فرق کے ساتھ ایک ہی سال میں پیدا ہوئے مگر پال جاز آئی ٹی کی دنیا میں چو کے چھلکے لگتا ہوا اور نئے ستاروں پر کمندیں ڈالتا ہوا ۵۶ سال کی عمر میں چلا بھی گیا۔ ادھر ہم ہیں کہ ابھی تک کوئی رن بنائے بغیر کریز پہ کھڑے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ شاندار ابھی کوئی کمزور بال ہمیں کھیلنے کو مل جائیگی۔

اے کاش کوئی نوجوان، کوئی سر پھرا، کوئی جنوں اس مٹی سے بھی اُٹھے اور سائنس و ایجادات کے نئے افق کو تلاش کرے، نئے آسمانوں کو تسخیر کرے۔ اے کاش ایسا ہو سکے۔

نوناہل مشاعرہ

موضوع: ”روشنی“



”روشنی“ کے موضوع پر ملنے والے اشعار سے اندازہ ہوا کہ ہمارے نوناہل کتنا اچھا ادبی ذوق رکھتے ہیں۔ اس موضوع پر زیادہ اشعار موصول ہوئے، اس لیے اس ماہ بھی یہی موضوع برقرار رہا، البتہ جنوری کے لیے نیا موضوع ہوگا ”یاد“۔

(ادارہ)

جگنو کی روشنی سے بھی کیا کیا بھڑک اٹھی
اس شہر کی فضا کہ چراغ آشنا نہ تھی
شاعر: احمد فراز (محمد عاشر خان، حیدرآباد)

کہیں کوئی چراغ جلتا ہے
کچھ نہ کچھ روشنی رہے گی ابھی
شاعر: ابرار احمد (عمیرہ صابر، کراچی)

بڑے خلوص سے مانگی تھی روشنی کی دعا
بڑھا کچھ اور اندھیرا چراغ جلنے سے
شاعر: نامعلوم (عبدالرحمن عارف، لاٹھی)

جلے تو ہیں شمع کی مانند مگر یہ کیا کم ہے
بڑھی ہے روشنی محفل وطن ہم سے
شاعر: ذکی کیفی (قاسم ساجد، صادق آباد)

جگنو کی روشنی ہے کاشانہ چمن میں
یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں
شاعر: علامہ اقبال (فاطمہ قیصر، کراچی۔ معززہ زائدہ، لاہور۔
رقیہ محمد عقیل شاہ، کراچی۔ سعد محمود، جگدانا معلوم)

وہ آئے بزم میں، اتنا تو برق نے دیکھا
پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی
شاعر: مہاراج بہادر برق (شاکر ذی شان، بلیر)

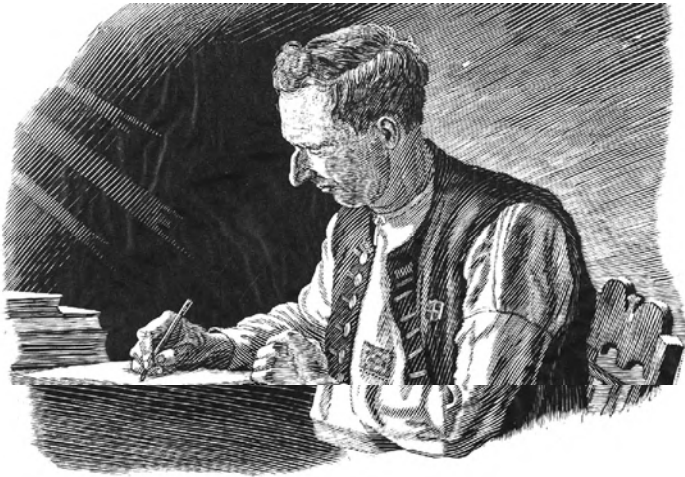
پروانہ اک پتنگا، جگنو بھی ایک پتنگا
وہ روشنی کا طالب، یہ روشنی کا سراپا
شاعر: علامہ اقبال (عبداللہ بھٹی، حیدرآباد)

میں اپنے آپ کو سلگا رہا ہوں اس توقع پر
کبھی تو آگ بھڑکے گی، کبھی تو روشنی ہوگی
شاعر: غبار بارہ بکوی (مفضل بن عدنان، حیدرآباد)

یہ مشہور ادیب، نقاد، کالم نگار کون ہے؟

سلیم فرخی

نام بوجھیے



یہ پہلی جنگِ عظیم کا زمانہ تھا۔ میں لاہور میں بھائی گیٹ کے اندر سٹھان نامی ایک محلے کی گلی مغلاں کے ایک مکان میں ۴ اپریل ۱۹۱۴ء میں پیدا ہوا۔ ماں سے میری جتنی قربت تھی، والد سے اتنا ہی دور بھاگتا تھا۔ ماں جی صبح باقاعدہ تلاوت کرتیں اور ہمیں تلقین کرتیں۔ سب کے بستر پر جا کر دم کرتیں۔ جب تک سب گھر والے نہ کھاپی لیتے، وہ کچھ نہ کھاتیں۔ سب کے پاس تھالی رکھتیں، جس میں روٹیاں اور ان کے اوپر سالن رکھا ہوتا تھا۔ انھیں آمنا دیکھ کر ہم اپنے ہاتھ چھپا لیتے،

کیوں کہ کھانے سے پہلے وہ ہمارے ہاتھ ضرور دیکھتیں جو عموماً گندے ہی ہوتے تھے۔ ماں کو ہمارے ہاتھوں کی فکر تھی تو دادی ہمارے پیروں پر نظر رکھتی تھیں اور جھانوے سے خوب مل مل کر دکھلاتی تھیں۔

ابا اکثر بے کار ہی رہتے تھے۔ مہینے میں دس بارہ روز کام کرتے اور باقی دن اپنے دوستوں کے ساتھ پگمیں لگاتے رہتے تھے۔ گھر میں اکثر لڑائی کی نوبت بھی آ جاتی تھی۔ ایسے میں سارے بچے ماں کی طرف ہو جاتے، لیکن اس کا کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ اباسب کو ایسی ڈانٹ پلاتے کہ کوئی آواز نہ نکالتا۔ ماں کہتیں بچوں کو ماں باپ کی باتوں میں نہیں بولنا چاہیے۔

ہمارے گھر کی ایک کٹھری میں کتابوں سے بھرا ایک صندوق بھی تھا، جو دادا جان کی طرف سے وراثتاً ملا تھا۔ ابا کو کتابوں سے صرف اتنی دل چسپی تھی کہ بس انھیں حفاظت سے ایک طرف رکھ دیا تھا۔ اس صندوق پر کسی کو پاؤں رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ میں بہت احترام سے صندوق کا ڈھکنا کھولتا، ایک ایک کتاب باہر نکالتا اور اسی طرح دو بارہ رکھ دیتا۔ آدھی سے زیادہ کتابیں قلمی تھیں، جنہیں یا تو دادا نے خود لکھا تھا یا دوسروں کے ہاتھ کی لکھی ہوئی خریدی تھیں۔ دادا کو کتابیں پڑھنے کا چسکا تھا۔ وہ کتابوں پر بہت پیسے خرچ کرتے تھے۔ محلے کے بڑے بوڑھے بتاتے تھے کہ مرزا غلام حسین (دادا) بڑے عالم فاضل آدمی تھے، افسوس! اولاد باپ پر نہیں گئی۔ میں سوچا کرتا تھا کہ اولاد باپ پر نہیں گئی تو کیا ہوا، میں یہ کتابیں ضرور پڑھوں گا۔

ایک دن ایسا ہوا کہ دادا جان کی ایک کتاب میری چھوٹی بہن کے ہاتھ سے گر گئی اور اس کی جلد پھٹ گئی۔ مجھے بڑا دکھ ہوا۔ اسی رات خواب میں دیکھا کہ ایک بزرگ لمبی سفید داڑھی لہراتے ہوئے میرے قریب سے چپ چاپ گزر گئے۔ ان کے چہرے پر ملال تھا اور ان کے ہاتھ میں وہی کتاب تھی، جو پھٹ گئی تھی۔ انھوں نے مجھ سے کچھ کہا تو نہیں، لیکن مجھے ایسا لگا جیسے کہہ رہے

ہوں کہ تم لوگوں نے اچھا نہیں کیا، میری کتاب تباہ کر دیں۔ اس کے بعد صندوق میں بڑا سا تالا لگا دیا گیا۔

گھر میں سرشام تیل کا دیا روشن ہو جاتا تھا۔ جب ہم سب لوگ کھاپی کر اپنے بستروں میں پہنچ جاتے تو عموماً نو دس بجے اسے بجھا دیا جاتا تھا۔ ابا کو نیند جلدی آ جاتی تھی، اس لیے اگر کسی کو دیے کی روشنی میں کچھ کام کرنا ہوتا وہ باہر دالان میں لے جاتا یا پھر صبح کا انتظار کرتا۔

مکان کے اوپری حصے میں کئی کمرے تھے۔ ایک دالان تھا جس کا ایک حصہ باورچی خانے کے طور پر استعمال ہوتا تھا، جس کی چھت دھوئیں سے کالی ہو گئی تھی۔ اس سے آگے کا حصہ تایا جان کا علاقہ تھا، جہاں وہ لوہے کی کرسی پر بیٹھ رہتے تھے۔ دالان کے ایک طرف جو کمرہ تھا، وہ بیٹھک کے طور پر استعمال ہوتا تھا، یعنی جہاں مہمانوں کو بٹھایا جاتا تھا۔ اس سے منسلک وہ کوٹھری تھی، جہاں دادا جان کی کتابوں کا صندوق رکھا تھا۔

میں نے بہت چھوٹی عمر میں کہیں مہندی کے پتے سو نگھے تھے، جس کی خوشبو میرے دماغ میں بس گئی تھی۔ دادی جان ہمارا مکان چھوڑ کر محلہ جلوئیاں چلی گئی تھیں۔ اس مکان کے دو حصے تھے۔ ایک میں دادی جان اور دوسرے میں پھوپھی جان رہتی تھی۔ دادی جان نے مجھے اپنے ساتھ رکھا تا کہ کوئی ہنر سکھانے کہیں بٹھا دیں۔ پہلے مجھے ایک ایسی جگہ بھیجا گیا، جہاں لوہے کا کام ہوتا تھا۔ میں وہاں سے تیسرے ہی دن بھاگ نکلا۔ اس کے بعد دادی مجھے ایک بڑھئی کی دوکان پر لے گئیں، وہاں تقریباً ایک ہفتہ جانے کے بعد میرا دل اُچاٹ ہو گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کام سکھانے والے استاد کے بالوں سے کڑوے تیل کی بو آتی تھی۔ جب کہ میرے ذہن میں تو مہندی کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ دادی جان نے لاکھ جتن کیے، مگر میں نے آوارہ گردی کو ہر ہنر پر ترجیح دی۔ دادی جان نے جب دیکھا کہ میں سیدھے راستے پر نہیں آتا، تو انھوں نے مجھے

”آزاد“ کر دیا یعنی مجھ پر سے توجہ ہٹا لی۔

میرے پھوپھا گائیں، بھینسیں خرید کر شہروں میں بیچا کرتے تھے۔ ان کے کہنے پر مجھے پرائمری اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ اب میں اپنے گھر میں رہنے لگا تھا۔ ایک دفعہ اسکول کی عمارت دوسری جگہ منتقل ہو گئی۔ اسکول سے واپسی پر میں راستہ بھول گیا۔ ایک نیک دل انسان مجھے روتا دیکھ کر اپنے گھر لے گیا۔ جہاں اس نے اور اس کی بیوی نے مجھے تسلی دی اور ہر طرح سے مجھے آرام پہنچایا۔ ان دونوں کے سلوک نے مجھے انسان سے محبت کرنا سکھایا۔ میں یہ احسان کبھی نہ بھول پایا۔

پرائمری کے بعد ابانے مجھے اسلامیہ ہائی اسکول بھائی گیٹ میں داخل کر دیا۔ ابھی تک مجھے صرف کہانیاں پڑھنے کا شوق تھا، لکھنے لکھانے سے دل چسپی نہیں تھی۔ اتنا ضرور تھا کہ کسی ادیب یا شاعر کا نام سنتا تو خیال آتا کہ کاش میں بھی ادیب یا شاعر ہوتا۔ بس میں نے سوچ لیا کہ شاعر ہی بنوں گا۔ نویں جماعت میں تھا کہ میری پہلی نظم ”ہفتہ روزہ“ ہلال“ میں چھپ گئی۔ یہ رسالہ میرے ہم جماعت ظہور الدین نیر کے بڑے بھائی مرزا محمد سلطان کیف نکالتے تھے۔ مقبول انور داؤدی صاحب اس کے ایڈیٹر تھے۔ میں نظمیں کہتا تھا، مگر کسی سے مشورہ نہیں لیتا تھا۔ داؤدی صاحب خود ہی اصلاح کر دیتے تھے۔ شاعری کی وجہ سے میری شہرت پورے اسکول میں پھیل گئی۔ پھر میں نے اختر شیرانی کی شاگردی اختیار کر لی۔ اسلامیہ کالج کے میگزین کریسنٹ کا ایڈیٹر بنا تو اس دوران نظم اور نثر دونوں چلتی رہیں۔ پھر چار سال بعد نثر نگاری کا ذوق نظم نگاری پر غالب آ گیا۔ کریسنٹ میں میرے کئی افسانے اور ڈرامے لکھے۔ میری ادبی زندگی کا باقاعدہ آغاز ۱۹۳۶ء سے ہوا۔ کالج کی تعلیم سے فارغ ہو کر کچھ دن بعد ”ادب لطیف“ کے دفتر پہنچ گیا۔ پرچے کے مالک چودھری برکت علی مجھے پہلے ہی جانتے تھے۔ ادب لطیف کا پہلا شمارہ حکیم احمد شجاع کی

ادارت میں شائع ہوا۔ دوسرے شمارے سے ادارتی فرائض میرے سپرد کر دیے گئے۔ تنخواہ پچیس روپے ماہانہ تھی۔ میں مجموعی طور پر تقریباً سترہ سال یہیں رہا۔ اس دوران پنجاب بک ڈپو کی درسی کتابوں کا کچھ کام میرے سپرد رہا۔ پانچ برس ریڈیو پر بھی بطور اسٹاف آرٹسٹ کام کیا۔

میں نے زندگی بھر صحرائیں نہیں دیکھا اور نہ کبھی کوئی جنگل دیکھا، لیکن میری کتاب ”صحرا نور کے خطوط“ بے تحاشا فروخت ہوئی۔ یہ محض تخیل کی پراور تھی۔ یہ خطوط میں نے قلعے کی سیڑھیوں کے اوپر لوہے کے جنگلے کے پاس بیٹھ کر لکھے تھے۔ میں تاروں کی چھاؤں میں کاغذ، پنسل اور ایک بڑی کتاب لے کر وہاں پہنچ جاتا۔ نیم تاریک فضا میں ٹہل ٹہل کر پلاٹ سوچتا رہتا۔ سورج نکلنے لگتا تو دیوار سے ٹیک لگا کر، کاغذ کتاب کے اوپر رکھ کر لکھنا شروع کر دیتا۔ جب پسینا بہنے لگتا اور پتھر کے فرش کی وجہ سے جسم دکھنے لگتا یا سر چکرانے لگتا تو لکھنا بند کر کے کچھ دیر ٹہل کر طبیعت بحال کرتا۔ کاغذ نہ کر کے کتاب میں رکھتا اور گھر کی راہ لیتا۔ یہ کتاب اس قدر مقبول ہوئی کہ ہندی اور انگریزی کے علاوہ کچھ خطوط روسی زبان میں بھی ترجمہ ہوئے۔

ادب کا مجھ پر بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے مجھے ایک گھٹن سے بچالیا۔ اگر میری زندگی میں لکھنے پڑھنے کا شغل نہ ہوتا تو ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جلد ہی موت کے غار میں پہنچ گیا ہوتا۔ میں انیس کتابوں کا مصنف تھا اور بہت سی کتابیں بچوں کے لیے بھی لکھیں۔ روزنامہ نوائے وقت میں کالم نگاری بھی کی۔

میری اعلا ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے ۱۹۸۱ء میں مجھے صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی عطا کیا۔ اس کے علاوہ مجھے ۶ مرتبہ رائٹرز گلڈ کے انعامات دیے گئے۔ ۳ مرتبہ میں نے گریجویٹ فلم ایوارڈ بھی حاصل کیے۔ ایک کتاب ”پس پردہ“ پر آدم جی ایوارڈ بھی ملا۔

۳۱ جولائی ۱۹۹۹ء کو لاہور میں میرا انتقال ہوا۔ ☆

شماره اکتوبر ۲۰۱۹ء میں پاکستان سے محبت کرنے والے ایک بڑے صنعت کار سر آدم جی حاجی داؤد سے آپ کی ملاقات کرائی گئی تھی۔ ہمیں خوشی ہے کہ نونہال اس دل چسپ معلوماتی سلسلے کو خوب پسند کر رہے ہیں اور مقابلے میں شریک ہو کر شخصیت کو شناخت بھی کر لیتے ہیں۔

اس بار درج ذیل نونہالوں نے نام بوجھ لیا ہے

☆ کراچی: واینا جنید، ماہم طارق، وردہ مصطفیٰ، عائشہ، حُر بن عباس شیخ، علینا اختر، عبدالرحمن عارف، یمنی شیخ، سیدہ ناہید زگس، سید شہنظل انظر، سید نیشل علی انظر، سیدہ ساکھ محبوب، سیدہ مریم محبوب، سید عفان علی جاوید، سیدہ جویریہ جاوید، البینہ انصاری، یمنی بنت صدیق بکر، رابعہ، محمد عزیز محمد نعیم، حسان خان، غیر طیب خان ☆ راولپنڈی: محمد عمار، شازرا احمد، محمد وقار الحسن ☆ ٹیاری: فاروق جان بہلم پٹھان، نیلو فرخان بہلم پٹھان، بابر گل خان بہلم پٹھان ☆ حیدر آباد: ماہ رخ، مریم بنت کاشف، صبا نیاز صدیقی، محمد یوسف قریشی، عائشہ ایمین عبداللہ ☆ صادق آباد: راؤ محمد عبداللہ ☆ میرپور خاص: محمد بلال عزیز ☆ سہارن چٹھہ: امامہ یوسف ☆ قلعہ دیدار سنگھ: سمیع اللہ ☆ مظفر گڑھ: احمد خاں لغاری ☆ پرانا سکھر: محمد حبیب ☆ دینہ: محمد عبداللہ حسن ☆ ٹنڈوالہیار: آمنہ آصف کھتری ☆ اسلام آباد: عائشہ سرور اعوان۔

قرعہ اندازی کے ذریعے انعامی کتاب حاصل کرنے والے نونہال:

- ۱۔ محمد عاقب مصطفیٰ، کراچی
- ۲۔ شاہ زیب اعجاز پھل، پھل شہر
- ۳۔ علی عمران کلاچی، ڈیرہ غازی خان

بلا عنوان انعامی کہانی



احمد عدنان طارق

وانگ جی بہت غریب تھا، لیکن اپنے گھر کا وہ بادشاہ تھا، کیوں کہ اس کے بیوی بچے اسے بہت پیار کرتے تھے اور اگر وانگ جی کو اپنے خاندان کے بدلے میں کوئی بادشاہت بھی دے دیتا تو وہ اسے لینے سے انکار کر دیتا۔ وہ سارا دن کھیتوں میں کام کرتا اور ہر رات اس کی بیوی اسے کھانے کے لیے ایک پیالے میں اُبلے ہوئے چاول دیتی اور کبھی کبھار منہ کا ذائقہ تبدیل کرنے کے لیے پھلیوں کا شوربہ یا پھر تلی ہوئی مچھلی، لیکن روز مچھلی کھانے کے لیے ان کے پاس اتنے پیسے نہیں ہوتے تھے، اس لیے عام طور پر اُبلے ہوئے چاول ہی کھائے جاتے۔

ایک دن وہ صبح صبح کام کرنے جا رہا تھا تو اس کی بیوی نے اپنے بیٹے ”ہان چنگ“ کو اس کے پاس بھیجا۔ ہان چنگ نے اسے یاد دلایا کہ جب وہ کام سے واپس آئے تو کچھ خشک لکڑیاں کاٹ کر لیتا



آئے۔ وانگ جی بولا: ”لکڑی کاٹنے کے لیے مجھے دوپہر کو پہاڑ پر چڑھنا ہوگا۔ میرے بیٹے جاؤ، میرا کلباڑا لے کر آؤ۔“

ہان چنگ باپ کا کلباڑا لینے گیا تو اس کی بہن ”ہوسن کو“ باپ کے پاس آئی اور وانگ جی سے لاڈ کرتے ہوئے کہنے لگی: ”بابا! کیا آپ کو یاد ہے آج گاؤں میں میلہ ہے۔ ہم سب کو اپنی اپنی لالٹین روشن کرنی ہے، اس لیے پہاڑ پر چڑھ کر سونہ جائیے گا۔ جلدی واپس آئیے گا، تاکہ ہم آگ جلا سکیں۔“ ہوسن کو کی لالٹین کی شکل بالکل ایک مچھلی کی طرح تھی۔ جو سرخ، سیاہ اور پیلے رنگ کی تھی اور ہان چنگ کی لالٹین بالکل دائرے کی طرح گول تھی اس کے علاوہ انھوں نے دو اور لالٹین بھی تیار کر رکھی تھیں، جنھیں روشن کر کے انھیں اندھیرے میں گھر سے باہر ٹانگنا تھا۔

وانگ جی اس میلے کو کبھی نہیں بھول سکتا تھا، کیوں کہ اس کے دونوں بچے ایک مہینے سے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ اس لیے بھی اس نے جلدی واپس آنے کا وعدہ کر لیا۔ دوپہر کو جب دوسرے کسانوں نے تھک کر کام چھوڑ دیا اور کھانے کے لیے بیٹھ گئے تو وانگ جی نے اپنا کلباڑا اٹھایا اور پہاڑ پر کسی خشک درخت کی تلاش میں چڑھنے لگا۔ وہ کافی دیر تک چلتا رہا۔ آخر ایک غار کے کنارے اسے مرضی کا درخت نظر آیا۔ جسے وہ ایندھن کے طور پر استعمال کر سکتا تھا۔

لیکن ابھی اس نے درخت کاٹنے کے لیے کلباڑا اٹھایا ہی تھا کہ اس نے یوں ہی غار میں جھانکا شاید یہ دیکھنے کے لیے کہ کیا یہ غار خالی ہے؟ لیکن وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ غار میں دو بوڑھے جن کی لمبی لمبی داڑھیاں ہیں، بہت خاموشی سے بیٹھے ہوئے شطرنج کی بساط بچھائے کھیل رہے ہیں۔ وانگ جی بھی شطرنج کے کھیل سے واقف تھا۔ وہ غار کے اندر چلا گیا اور کھیل کو دیکھنے لگا۔ اس نے دل ہی دل میں خود سے کہا، جیسے ہی ان میں سے کسی نے سر اٹھایا تو میں پوچھ لوں گا کہ کیا میں درخت کاٹ لوں؟

لیکن ان میں سے کسی نے سر نہیں اٹھایا، بلکہ وانگ جی بھی کھیل میں اتنا کھو گیا کہ اس نے کلباڑا زمین پر رکھ دیا اور خود بیٹھ کر کھیل دیکھنے لگا۔ دونوں بوڑھے آلتی پالتی مارے زمین پر بیٹھے تھے اور ایک پتھر کو میز کی طرح استعمال کرتے ہوئے شطرنج اس پر رکھی ہوئی تھی۔

ان کے قریب ہی ایک کونے میں پڑے ہوئے پتھر پر کچھ بھورے رنگ کی ٹکیاں رکھی ہوئی تھیں، جنہیں وانگ جی پہلے سخت کھجوریں سمجھا، لیکن کچھ وقفے کے بعد دونوں بوڑھوں نے ایک ایک ٹکیا اٹھا کر منہ میں رکھی اور ایک ٹکیا اٹھا کر وانگ جی کے منہ میں ڈال دی۔ تب اسے اندازہ ہوا کہ وہ کھجور نہیں تھی۔ وہ ٹکیا بہت میٹھی اور مزے دار تھی۔ اس سے مزے دار چیز وانگ جی نے پوری زندگی نہیں چکھی تھی اور سب سے حیرانی والی بات یہ تھی کہ اس کے منہ میں ڈالتے ہی وانگ جی کی بھوک اور پیاس بالکل ختم ہو گئی۔

وہ جب غار میں داخل ہوا تھا تو بھوکا اور پیاسا تھا، کیوں کہ اس نے دوسرے کسانوں کے ساتھ کھانا نہیں کھایا تھا، لیکن اب وہ ہشاش بشاش تھا اور اسے بھوک نہیں لگ رہی تھی۔ وہ کچھ دیر اور وہیں بیٹھا رہا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ جب بھی بوڑھے شطرنج کا کوئی مہرہ ہلاتے تو ان کی داڑھیاں اور لمبی ہوجاتیں حتیٰ کہ وہ غار میں زمین کو چھونے لگیں۔

وانگ جی آخر اُٹھا اور کلہاڑا اُٹھا کر بولا: ”شکر ہے میری داڑھی اتنی تیزی سے نہیں بڑھتی۔“ تب آخر ایک بوڑھا بولا: ”اے جوان! ہماری داڑھیاں بھی اتنی تیزی سے نہیں بڑھتیں، تمہیں یہاں آئے کتنی دیر ہو گئی ہے؟“

وانگ جی نے اسے جواب دیا: ”آدھا گھنٹہ ہو گیا ہوگا۔“

وہ جواب دے ہی رہا تھا کہ اس کا کلہاڑا مٹی بن کر زمین پر بکھر گیا۔ تب دوسرا بوڑھا ہنسا اور بھوری ٹکیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگا: ”آدھا گھنٹہ یا آدھی صدی!! یا پانچ سو سال۔ جو یہ مٹھائی کھاتا ہے، اس کے لیے وقت ٹھہر جاتا ہے۔ اپنے گاؤں میں جا کر دیکھو تو تمہیں معلوم ہوگا کہ کیا کچھ بدل گیا ہے۔“

یہ سن کر وانگ جی جتنی تیزی سے بھاگ سکتا تھا، گاؤں کی طرف بھاگا۔ راستے میں اس نے دیکھا جہاں وہ کھیتوں میں کام کیا کرتا تھا وہاں ایک بڑا شہر بسا ہوا ہے اور مکان ہی مکان بنے ہوئے ہیں۔ یہ ناممکن تھا کہ اتنے بڑے شہر میں وہ اپنا گاؤں ڈھونڈ پاتا۔ بے بسی سے اس نے ادھر ادھر اپنے بچوں اور اپنے گھر کو ڈھونڈا۔ وہاں ہر طرف ایسے لوگ آ جا رہے تھے جنہیں وہ پہچانتا نہ تھا۔

اگرچہ اس شام پھر لالٹینوں کا میلہ منایا جا رہا تھا، کہیں بھی ہان چنگ اور ہوسن کو کا نام و نشان نہیں تھا۔ پھر اسے ایک بہت بوڑھی عورت ملی۔ اس نے بتایا کہ جب وہ ننھی بچی تھی تو اس کی دادی اماں اسے اپنے بچپن کا واقعہ سناتی تھیں کہ ایک غریب شخص کو پہاڑ کے بھوت اُٹھا کر لے گئے تھے اور میلے کے دن اس کی بیوی اور بچے اکیلے رہ گئے تھے اور ان کے پاس مٹھی بھر چاولوں کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ کہنے لگی: ”اگر تم میلے کے جلوس گزرنے تک یہاں ٹھہرو تو تم دیکھو گے کہ دو بچے جلوس کے آگے چل رہے ہوں گے اور انھوں نے ہان چنگ اور ہوسن کو جیسا لباس پہنچ رکھا ہوگا اور ان کے ساتھ ان کی ماں بنی ایک عورت ہوگی جس کے ہاتھ میں چاولوں کا پیالہ ہوگا۔“

لہذا وانگ جی وہیں سڑک پر انتظار کرنے لگا اور واقعی اس نے جلوس میں بچوں اور پیالہ پڑے عورت کو دیکھا، لیکن وہ اس کی بیوی اور بچے نہیں تھے۔ وانگ جی کا جی بھرا آیا۔ وہ شہر سے باہر نکل آیا۔ رات اس نے پہاڑ پر سو کر گزاری اور اگلی صبح وہ غار میں آیا وہاں اب بھی دونوں بوڑھے شطرنج کھیل رہے تھے۔

پہلے تو انھوں نے وانگ جی سے کہا کہ وہ اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتے اور وہ انھیں پریشان نہ کرے، لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ وانگ جی وہاں سے ہلنے والا نہیں ہے تو انھوں نے اسے رستہ بتاتے ہوئے کہا: ”تمہیں چاند پر رہنے والے سفید خرگوش کے پاس جانا ہوگا اور اس سے آب حیات سے بھری ہوئی شیشی مانگنی ہوگی۔ اگر تم اسے پیو گے تو ہمیشہ زندہ رہو گے۔“

وانگ جی بولا: ”لیکن میں ہمیشہ زندہ رہنا نہیں چاہتا میں صرف اپنے بیوی اور بچوں کے ساتھ باقی زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔“

تب ایک بوڑھا بولا: ”تو پھر تو تمہیں آب حیات میں آسمان پر رہنے والے اژدھے کے منہ سے نکلنے والا پانی ملانا پڑے گا۔“

وانگ جی پوچھنے لگا: ”اور یہ آسمانوں پر رہنے والا اژدھا مجھے کہاں ملے گا؟“

بوڑھا بولا: ”ظاہر ہے وہ آسمان پر رہتا ہے۔ وہ بادلوں میں بنی ہوئی ایک غار میں رہتا ہے۔ وہ کبھی غار سے باہر آتا ہے تو اس کے منہ سے شعلے نکلتے ہیں اور کبھی پانی۔ اگر شعلے نکلے تو تم جل جاؤ گے اور اگر پانی نکلا تو تم اسے آسانی سے حاصل کر لو گے اور تمہیں کیا چاہیے؟“

یہ سن کر بھی وانگ جی غار کے منہ پر جمار ہا وہ کہنے لگا: ”مجھے اُڑنے کے لیے پُر چاہیں اور پانی کے لیے شیشی۔“

انہوں نے اسے ایک شیشی دی اور اس سے پہلے کہ وہ شکر یہ ادا کرتا، اُدھر سے ایک بہت خوب صورت سفید بگلا اُڑتا ہوا آیا اور غار کے منہ کے باہر بیٹھ گیا۔ بوڑھا کہنے لگا: ”یہ بگلا تمہیں وہاں لے جائے گا اب جاؤ اور ہمیں مزید پریشان نہ کرو۔“

وانگ جی بگلے کی پیٹھ پر سوار ہو گیا اور وہ اسے بادلوں میں اُڑاتا ہوا اُڑ دھے کے غار کے قریب لے گیا۔ اُڑ دھے کا سر ایک اونٹ جتنا تھا۔ بارہ سنگھ کی طرح سر پر سینگ تھے۔ اس کی آنکھیں خرگوش جیسی تھیں۔ کان گائے کی طرح اور عقاب کی طرح کے نیچے تھے۔ اس کے علاوہ اس کی داڑھی اور مونچھیں بھی تھیں اور اس کی داڑھی میں ایک سفید موتی بھی پرویا ہوا تھا۔ یہ سب چیزیں اسے اصلی اُڑدہ ثابت کرتی تھیں۔

وانگ جی بہت خوف زدہ تھا اور اگر اسے بیوی بچوں کا خیال نہ ہوتا تو وہ غار کے نزدیک بھی نہ جاتا۔ غار کے باہر گھاس اُگی ہوئی تھی۔ وانگ جی کو ایک ترکیب سوچھی جس سے وہ اُڑ دھے کے منہ سے نکلے والے شعلوں سے بچ سکتا تھا اور پانی لے سکتا تھا۔ اس نے گھاس کو آگ لگا دی۔ گھاس اتنی سوکھی تھی کہ اس میں لگنے والی آگ کے شعلے غار کے منہ تک پہنچ گئے۔ اُڑ دھے نے غار میں دھواں جمع ہوتے دیکھا تو اس نے یہ دیکھنے کے لیے کہ کیا ہوا ہے، غار سے سر باہر نکالا۔ پھر باہر کا ماحول دیکھ کر چلا کر بولا: ”میں اس آگ کو ابھی بجھا لیتا ہوں۔“

پھر اس نے زور سے سانس لیا تو اس کے دو تھنوں اور منہ سے پانی کے تین فوارے نکلے، لیکن اتنا پانی آگ بجھانے کے لیے کافی نہیں تھا۔ اب اس نے دوبارہ زور زور سے سانس لیا تو فواروں کی جگہ تین بڑے دریا بہنے لگے۔ وانگ جی نے جلدی سے شیشی میں پانی بھرا اور بگلے کی کمر پر سوار ہو گیا کہ کہیں اتنے پانی میں ڈوب ہی نہ جائے۔ وانگ جی کا بگلا پھر اُڑا اور اُڑتا ہوا چاند پر جا پہنچا۔ وانگ جی سیدھا خرگوش کی جھونپڑی کی طرف گیا اور جھونپڑی کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ تب بھی خرگوش بیٹھا پانی میں کچھ حل کر رہا تھا تا کہ آبِ حیات بنا سکے۔ اس نے جھونپڑی کا دروازہ کھولا

اور وانگ چی کو اندر آنے کی دعوت دی۔ چاند کے خرگوش کا رنگ بہت سفید تھا۔ چاند کا خرگوش سب جانتے ہیں کہ ایک ہزار سال تک زندہ رہتا ہے اور پانچ سو سال کی عمر میں اس کا رنگ بھورے سے سفید ہو جاتا ہے۔ یہ نشانی ہوتی ہے کہ اب یہ خرگوش بہت عقل مند ہو گیا ہے۔

خرگوش کو جیسے ہی وانگ چی کی خواہش کا علم ہوا تو اس نے جھونپڑی میں بنی ہوئی دو کھڑکیوں کے کواڑ کھول دیے اور وانگ چی سے کہنے لگا کہ ان میں جھانک کر دیکھو اور مجھے بتاؤ تمہیں ان کھڑکیوں سے کیا دکھائی دیا؟

وانگ چی نے ایک کھڑکی میں جھانکا اور خرگوش کو بتایا: ”مجھے اس میں سے وہی شہر، وہی لوگ اور وہی گھر دکھائی دے رہے ہیں جنہیں میں نے کل دیکھا تھا۔ یہ سب یہاں کیسے آ گیا؟“

خرگوش نے کہا: ”یہ راز ہے، تمہارے سمجھ میں بہت سی چیزیں نہیں آئیں گی۔ سوال یہ ہے کہ تم ماضی میں کیسے جاسکتے ہو؟ اب یہ کھڑکی بند کر دو یہ حال کے زمانے کی کھڑکی ہے اور دوسری کھڑکی ماضی کی ہے۔“

وانگ چی نے خرگوش کے کہنے پر عمل کیا۔ اس نے دوسری کھڑکی کھولی تو اس کی نظروں کے سامنے اس کا پرانا، پیارا گاؤں تھا۔ ہان چنگ اس کا بیٹا اور ہون کو اس کی بیٹی خوشی خوشی گھر کی دیوار کے ساتھ لالٹینیں ٹانگ رہے تھے۔ ہان چنگ کہہ رہا تھا کہ بابا کو آتے دیر ہو گئی ہے۔ وانگ چی نے مڑ کر بے بسی سے خرگوش کو دیکھا اور اسے کہنے لگا: ”مجھے ان کے پاس جانے دو۔ میرے پاس آسمانی اژدھے کے منہ سے نکلا ہوا پانی بھی ہے اور.....“

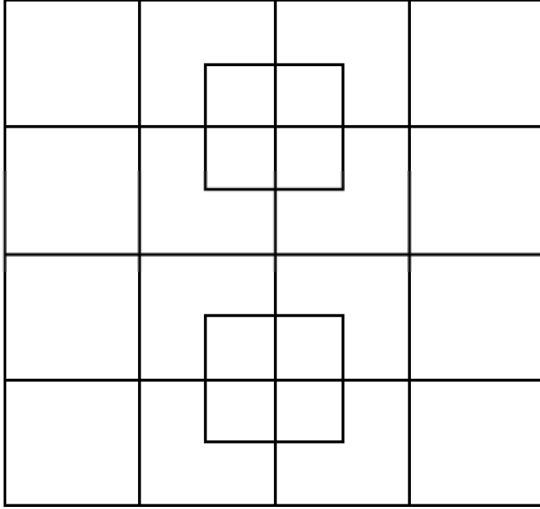
خرگوش نے اس سے شیشی لے لی اور اس میں پہلے پانی کے ساتھ آبِ حیات ملا دیا۔ پھر اس نے وانگ چی کو وہ پانی پلا دیا۔ جیسے ہی اس نے پانی پیا کھڑکی بہت بڑی ہو گئی اور اس میں سے سیڑھیاں گاؤں کی طرف اُترنے لگیں۔

خرگوش کا شکر یہ ادا کر کے وہ بھاگا اور بیوی بچوں کے پاس پہنچا، جو روشنیاں جلانے ہی والے تھے۔ وہ گلا کر رہے تھے کہ وہ دیر سے کیوں آیا، لیکن اس نے کسی سوال کا جواب نہیں دیا۔ صرف خاموشی سے ان کے ساتھ بتیاں جلانے لگا۔ میلے پر ہر کوئی شخص خوش تھا، لیکن اتنا نہیں جتنا وانگ چی تھا۔

Press ad

Page 65

اس خاکے میں آپ کتنے چوکور (مربع) گن سکتے ہیں؟



اعداد اس طرح لکھتے چلے جائیے کہ ہمارے لکھے ہوئے اعداد متاثر نہ ہوں

		—		66
+	×		—	=
13	12		11	10
×	+		+	—
:	+		×	:

وقت دیکھ کر دونوں تصاویر کے درمیان دس فرق تلاش کریں۔
کم سے کم وقت میں فرق تلاش کرنا ہی اصل ذہانت کہلائے گا۔



منہی منی چڑیاں

شیخ عبدالحمید عابد

تم روزی آسمان کی گود میں اڑتی ہوئی منہی منی چڑیوں کو دیکھتے ہو گے۔ یقیناً تمہارے منہ سے دلوں میں بھی یہ آرزو پیدا ہوتی ہوگی کہ تم ان پرندوں کی طرح آسمان کی وسعتوں میں اپنے بازو پھڑپھڑا کر اڑو۔ تمہاری یہ تمنائی نہیں ہے۔ اب سے چند صدیاں پہلے بھی انسان نے یہی کچھ سوچا تھا۔ چڑیوں کو اڑتے دیکھ کر ہی اس کے دل میں یہ آرزو ابھرتی تھی۔ ان قدرتی ہوائی جہازوں کو دیکھ کر اس نے موجودہ ہوائی جہاز ایجاد کر ڈالا، جس میں بیٹھ کر تم ناشتا کراچی میں کرو تو دوپہر کا کھانا بڑی آسانی سے لندن میں کھا سکتے ہو۔



اللہ تعالیٰ نے چڑیوں کو آسمان کی حسین ترین مخلوق بنا کر ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ انھیں تخلیق کرتے وقت ان کی آڑان کا پوری طرح خیال رکھا گیا ہے۔ ان کی جسمانی بناوٹ سے صاف ظاہر ہے کہ اس چھوٹے سے گوشت پوست کے لوتھرے کو کچھ اس انداز سے ڈھالا گیا ہے، جس سے وہ آسانی سے ہزار ہا کلو میٹر کا سفر طے کر سکے۔ ان کے بازوؤں سے منسلک پدوں کو اس طرح بنایا گیا ہے کہ انھیں اڑنے میں کسی قسم کی دشواری نہ ہو۔

خدا نے چڑیوں کو ہمارا دل بہلانے کو ہی نہیں بنایا، بلکہ یہ ہمارے لیے نہایت مفید اور کارآمد بھی ہیں۔ چڑیوں کو ہم اپنی جہائی کا ساتھی اور تفریح کا ذریعہ بناتے ہیں۔ بہت سی چڑیوں کے پر کام میں لائے جاتے ہیں۔ ان سے ہیٹ اور ٹوپیاں سجائی جاتی ہیں۔ یہ ایسے کیڑے مکوڑوں کو بھی کھاتی ہیں جو انسان کو بیمار کرنے والے ہوتے ہیں۔ اپنے بچوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کا کام چڑیاں بڑی خوبی سے انجام دیتی ہیں۔ جس سے ایک علاقے کی نسل دوسری جگہ پہنچ جاتی ہے۔



چڑیوں کا دماغ بہت نازک اور چھوٹا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس ان کی آنکھیں بڑی اور تیز ہوتی ہیں۔ قدرت نے انھیں آنکھوں کی حفاظت کے لیے ایک ہلکی سی جھالرنایت کی ہے، جو ان کی آنکھوں کو کسی قدر ڈھانپنے رہتی ہے۔ آنکھوں کا بہت ٹھوڑا سا حصہ اس کی زد سے باہر رہتا ہے، تا کہ لمبی اڑان کا اثر ان کی آنکھوں پر نہ پڑ سکے۔ اسی طرح دھول، گرد و غبار، آندھی طوفان کے جھکڑ اور بارش ان کی نظر پر کسی قسم کا بُرا اثر نہ ڈال سکے۔

عام طور پر چڑیوں کی دیکھنے کی قوت ہماری اور آپ کی نظر سے دس گنا زیادہ ہوتی ہے۔ چڑیوں میں محسوس کرنے کی صلاحیت بھی بہت زیادہ ہوتی ہے۔ وہ سورج کا رُخ اور مقام دیکھ کر موسم کا اندازہ کر کے محفوظ مقام پر چلی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر سخت سردی پڑنے پر وہ کسی قدر گرم خطوں کی جانب اڑان شروع کر دیتی ہیں۔ اسی طرح مناسب وقت پر ساحلی علاقوں میں بھی ان کا آنا جانا شروع ہو جاتا ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ فضا میں اپنا راستہ یاد رکھتی ہیں۔

آپ کو یہ جان کر بھی حیرت ہوگی کہ ان کے دل کی دھڑکن ایک منٹ میں پانچ سو بار ہوتی ہے۔ ہمارے جسم کا ٹمپرچر 98.6 فارن ہائیٹ ہوتا ہے اور ان کے جسم کی حرارت عام طور پر 110 فارن ہائیٹ کے لگ بھگ ہوتی ہے۔ ہمارے جسم کی ہڈیاں سخت اور ٹھوس ہوتی ہیں، لیکن چڑیوں کی نازک نازک سی ہڈیاں تیلیوں کی طرح ہلکی پھلکی اور کھوکھلی ہوتی ہیں، تا کہ ان کا وزن کم ہو سکے۔ چڑیوں کی رفتار بہت زیادہ ہوتی ہے۔ بعض کی رفتار اس قدر زیادہ ہوتی ہے کہ تیز رفتار کیمرے بھی ان کی حرکات کی صحیح تصویر لینے میں ناکام رہتے ہیں۔ چڑیاں زمین پر اترتے وقت اپنے پنجوں سے مدد لیتی ہیں۔ سینے کا حصہ بھی اترنے میں مدد کرتا ہے۔ یہ اپنے نازک پنجوں کی مدد سے آسانی سے زمین پر اتر جاتی ہیں۔

چڑیاں اپنے رنگ ڈھنگ اور طبیعتوں کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہیں۔ جس طرح انسانوں میں

مختلف رنگ، نسل اور مذہب و عقیدے کے لوگ ہوتے ہیں۔ کچھ اسی انداز کی ان کی اپنی برادری بھی ہوتی ہے۔ تم نے خوب صورت سے خوب صورت اور بد صورت سے بد صورت دونوں قسم کی چڑیاں دیکھی ہوں گی۔ کچھ کی مدھر آواز اچھی لگتی ہے اور کسی کی کڑوی آواز تمہیں بُری لگتی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ میٹھی اور مدھرتائیں ہمارے لیے نہیں ہوتیں، یہ صرف اپنے جوڑوں کو خوش کرنے اور اپنی طرف راغب کرنے کے لیے ان کا ایک پیغام ہوتا ہے۔

چڑیاں بڑی اچھی دست کار اور فن کار ہوتی ہیں۔ جفاکشی اور تن دہی سے ایک ایک تنکا اکٹھا کر کے اپنے گھونسلوں کی تعمیر کرتی ہیں۔ تنکوں کو ملا کر وہ اس ڈھنگ سے پروتی ہیں کہ اچھا خاصا ایک جال سا دکھائی دیتا ہے۔ کچھ چڑیوں کے گھونسلے تو اس قدر مضبوط ہوتے ہیں کہ ان کی پانچ نسلیں بھی اس میں رہنا چاہیں تو بڑے مزے سے رہ سکتی ہیں۔

یہ ننھی منی چڑیاں بڑی پیٹھ ہوتی ہیں۔ بعض چڑیاں جن کا اپنا وزن 21 گرام ہوتا ہے۔ 48 گرام تک دانہ چُگ لیتی ہیں یعنی اپنے وزن سے بھی کہیں زیادہ ویسے عام طور پر چڑیاں دن بھر میں اپنے وزن کے برابر یا کم از کم اپنے وزن کا آدھا دانہ تو ہر حالت میں چُگ لیتی ہیں۔ یہ نہ صرف اتنا کھانا کھاتی ہیں بلکہ دن بھر کی اڑان اور اُچھل کود میں اسے آسانی سے ہضم بھی کر لیتی ہیں۔

عام طور پر چڑیاں دو کلو میٹر کی بلندی تک اُڑ لیتی ہیں۔ اتنی ہی اونچائی پر رہ بھی لیتی ہیں۔ شدید گرمی کے موسم میں یہ میدانوں کو چھوڑ کر اونچے مقامات پر چلی جاتی ہیں، فاصلہ طے کرنے میں بھی یہ اپنی مثال آپ ہیں۔

سائنس دانوں کے مطابق دنیا بھر میں پرندوں کی 8500 کے لگ بھگ اقسام پائی جاتی ہیں۔ جن میں سے زیادہ تعداد چڑیوں کی ہے۔



۱۳ سالہ سائنس داں



دنیا کا سارا نظام اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جسے چاہے سب سے منفرد صلاحیت عطا کرے۔ اسی نے امریکا کے ۱۳ سالہ طالب علم ”ڈینیئل لوکی“ کو ایسی ذہانت دی ہے کہ وہ کم عمری میں کیمیا داں اور کئی تحقیقی مقالوں کا مصنف بن گیا ہے۔ وہ گیارہویں جماعت کا طالب علم ہے اور ”ٹولیدو یونیورسٹی“ میں انڈرگریجویٹ محقق بھی

ہے۔ اس نے اپنے اسکول کے سینئر اور جونیئر دوستوں سے کہہ رکھا ہے کہ اگر کیمیا سے متعلق کوئی سوال ان کی سمجھ میں نہ آ رہا ہو تو میرے ای میل پر رابطہ کریں، فوراً اس کا حل بتا دوں گا۔ یہ بچہ یونیورسٹی کے شعبہ ماحولیات اور ریڈیالوجی سیفٹی میں سائنس داں ہے۔ یہاں ۱۲ سال سے کم عمر بچوں کا داخلہ منع ہے۔

ائرکنڈیشنڈ اور ہیٹر ایک ساتھ

انسان ہمیشہ سے سہل پسند رہا ہے۔ زندگی میں ہر طرح کی سہولت چاہتا ہے۔ جتنی بھی ایجادات ہوئی ہیں، ان میں بیشتر اسی جذبے کے تحت سامنے آئی ہیں۔ سان ڈیاگو (امریکا) کی یونیورسٹی کیلیفورنیا کے سائنس داں ”رنکن چین“ نے ایک ایسا آلہ ایجاد کیا ہے جو گھریا باہر، دفتری یا کسی



بھی مقام پر آپ کو ٹھنڈک یا حرارت پہنچاتا ہے۔ یعنی گرمی ہو تو ائرکنڈیشنڈ کا کام کرے گا اور سردی میں حرارت

پہنچائے گا۔ اس کا استعمال بھی نہایت آسان ہے۔ یہ بلڈ پریشر ناپنے والی پٹی کی طرح ہے جسم سے چپک جاتا ہے اور بہت نرم اور ہلکا پھلکا آلہ ہے۔ اس کی بیٹری بھی بہت ہلکی ہے۔ یہ آلہ درجہ حرارت بڑھانے اور کم کرنے کا عمل خود کار طریقے سے کرتا ہے۔

گلابی جیلیں

محققین نے ثابت کیا ہے کہ انسانی ذہن پر رنگوں کے اثرات ضرور پڑتے ہیں مثلاً کالا رنگ مایوسی اور غم



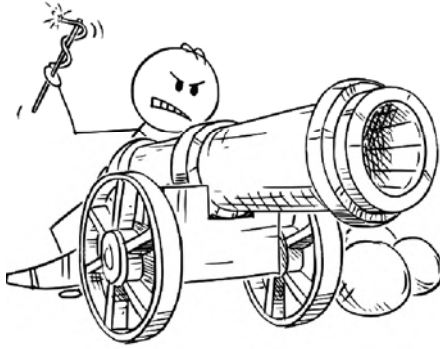
کی علامت ہے۔ سفید رنگ پاکیزگی کا احساس دلاتا ہے اور نیلے رنگ سے ٹھنڈک محسوس ہوتی ہے۔ سبز رنگ آنکھوں کے لیے بہتر ہے۔ سوئزرلینڈ میں جیلوں کی انتظامیہ نے بیرکوں میں ہلکا گلابی رنگ کر دیا ہے۔ اس سے قیدیوں میں اشتعال کم ہوگا، ان کے موڈ پر اچھے اثرات مرتب ہوں گے۔ اس منصوبے کو

”کول ڈاؤن پنک“ کا نام دیا گیا ہے۔ یورپ کے کئی ممالک میں اسی طرح کے اقدام کیے گئے ہیں۔

پانچ منزلہ عمارت منتقل

چین ایک عظیم ملک ہے اور چینی قوم باکمال ہے۔ چینی ماہر تعمیرات اپنی مثال آپ ہی ہیں۔ چینی انجینئرز ایسے ایسے کام انجام دے لیتے ہیں جو ناممکن نظر آتے ہیں۔ ان کی مہارت دیکھ کر دنیا حیران رہ جاتی ہے۔ چین کے شہر ”شیامن“ میں ایسا ہی ایک کارنامہ دیکھا گیا۔ وہاں بس ٹرمینل کی پانچ منزلہ عمارت کو گرائے بغیر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر دیا گیا۔ اس عمارت کا وزن تیس ہزار ٹن تھا، جو فرانس کے ایفل ٹاور سے چار گنا زیادہ تھا۔ عمارت حیرت انگیز طور پر ہائیڈرولک جیک کی مدد سے اٹھائی گئی۔





توپ کے دہانے

میں نیند

ابن انشا

انگلستان میں میرا پہلی بار جانا اتفاقہ ہی ہوا۔ میں کچھ سامان جہاز کے راستے ہمہرگ بھیجنے کے لیے قریبی بندرگاہ پر گیا تھا۔ وہاں سے واپسی میں دھوپ بہت تیز تھی۔ ایک تو دن بھر کے کام کی تھکن، دوسرا دھوپ۔ سر راہ مجھے ایک توپ رکھی نظر آئی تو میں اس کی نال میں گھس کر لیٹ گیا۔ تھکن کی وجہ سے ایسی نیند آئی کہ کسی بات کا ہوش نہ رہا۔ یہ دوپہر کی بات ہے۔ اتنے میں ایک بج گیا اور وقت کا اعلان کرنے کے لیے توپ داغ دی گئی، جس میں پہلے سے بار دو وغیرہ بھرا رکھا تھا۔ ان لوگوں کو کیا خبر کہ ایک آدمی توپ کی نال میں لیٹا سو رہا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں جو گولے کی طرح نکلا تو دوسری طرف ایک زمیندار کے کھلیان میں جا گرا۔

بھوسے کی وجہ سے کچھ چوٹ نہ آئی، بلکہ آنکھ بھی نہ کھلی۔ کوئی تین مہینے ایسے ہی گزر گئے، حتیٰ کہ بھوسے کے دام چڑھ گئے اور کسان نے اسے بیچنے کے لیے منڈی بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ جس زمیندار کے ڈھیر پر میں جا گرا تھا وہ سب سے بڑا تھا۔ زمیندار کے کارندے جو بھوسا اُتارنے کے لیے سیڑھی لگا کر چڑھے تو میری آنکھ کھل گئی۔ میں اس زمیندار کے سر پر آن کر گرا، جس سے ان کی گردن ٹوٹ گئی، لیکن مجھے کوئی آنچ نہ آئی۔

بعد میں مجھے یہ جان کر اطمینان ہوا کہ وہ زمیندار بڑا نا بکا رہا۔ ہمیشہ مال منہگا کر کے بچتا تھا۔ اس کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔

گنتی کا گیت

ایف۔سلطانہ مہر

- | | | | |
|-----|--------------------------|------|-------------------------|
| (۱) | آؤ بچو بولو ایک | (۶) | ایک روپے میں کیے چھے |
| | پھر سب مل کر کاٹو کیک | | میٹھے بھی ہیں اور اچھے |
| (۲) | ایک کیک کے بن گئے دو | (۷) | تھالی میں ہیں لڈو سات |
| | اپنا اپنا حصہ لو | | سب دے دو تو پھر کیا بات |
| (۳) | ایک پٹاری، ناگ ہیں تین | (۸) | یہ دیکھو، یہ پیڑے آٹھ |
| | ناچے ناگن، باجے بین | | آج ہمارے دیکھو ٹھاٹھ |
| (۴) | کشتی ایک اور لڑکے چار | (۹) | بین رہے ہیں بچے نو |
| | ہمت ہو تو بیڑا پار | | گہیوں، چاول، باجرہ، جو |
| (۵) | ایک ہاتھ میں انگلی پانچ | (۱۰) | گن لو آم یہ پورے دس |
| | سانچ کو بھائی، کب ہے آٹھ | | پی لو ٹھنڈا میٹھا رس |

مہر کی گنتی رکھنا یاد
سدا رہو گے بچو شاد



افواہ سازی

رابعہ فاروق

بہت سے لوگوں کو بات بڑھا چڑھا کر بیان کرنے کی عادت ہوتی ہے۔ بات اتنی ہوتی نہیں جس قدر وہ بڑھا کر بیان کرتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کے لیے کہا جاتا ہے: ”رائی کا پہاڑ بنانے والے“ یا ”پُر سے پرندہ بنانے والے“، یعنی مبالغے کی حد کر دیتے ہیں۔

ہمارے محلے کی ایک خاتون خالہ نسیمہ ایک دفعہ ہمارے گھر آئیں۔ کہا کہ پڑوس والے اسلم صاحب کافی بیمار ہیں۔ ڈاکٹروں نے کینسر بتایا ہے۔ بہت پریشان ہیں بے چارے۔ مالی مدد چاہتے ہیں۔ یہ سن کر امی ابو کو بہت افسوس ہوا۔ ابو نے اپنی بچت سے چند ہزار روپے لے کر اسلم



صاحب کے گھر چلے گئے۔ کیا دیکھا کہ اسلم صاحب کرسی پر بیٹھے اخبار پڑھ رہے ہیں اور ماشاء اللہ بالکل تن درست لگ رہے ہیں۔ ابو ہکا بکا رہ گئے۔ اسلم صاحب نے مسکرا کر کہا: ”آئیے آئیے شاہد بھائی! کیسے ہیں آپ؟“

ابو نے کہا: ”جی میں تو ٹھیک ہوں آپ سنائیے، سنا ہے بیمار ہیں۔“
 ”ارے شاہد بھائی؟ بس ملیریانے ایسا لپیٹ میں لیا کہ ساری طاقت جیسے نکل گئی۔ اب تو خدا کے فضل سے بالکل ٹھیک ہوں، بس کچھ کم زوری اب بھی باقی ہے۔ دوائیں باقاعدگی سے لے رہا ہوں۔ آپ سنائیں اپنا حال احوال۔“

ابو یہ سن کر حیران رہ گئے۔ بہر حال انھوں نے اسلم صاحب سے کوئی تذکرہ نہ کیا۔ خوانخواہ شرمندگی اٹھانی پڑتی۔ گھر آ کر امی کو ساری بات بتائی۔ امی نے کہا: ”توبہ توبہ کس قدر جھوٹی عورت ہے یہ نسیم۔“



آج عامر بس اسٹاپ پر دیر سے پہنچا۔ بس نکل گئی۔ وہ اسکول نہ پہنچ پایا۔ عدنان نے شام کو گھر آ کر بتایا: ”سراسحاق بہت غصے میں تھے۔ کہہ رہے تھے، عامر نالائق اور غیر ذمے دار لڑکا ہے، جب آئے گا تو اس کی اچھی طرح خبر لوں گا۔“

عامر یہ بات سن کر پریشان ہوا۔ صبح ہونے والی بے عزتی کے خوف سے وہ ساری رات سو نہ سکا۔ اگلے دن اسکول گیا اور سراسحاق کے پیئرڈ سے پہلے ان کے پاس اسٹاف روم گیا کہ کہیں کلاس میں بے عزتی نہ ہو جائے۔ ڈرتے ڈرتے اس نے سر سے کہا: ”سر! میں پرسوں اس لیے نہیں آ سکا تھا کہ بس چلی گئی تھی، اس وجہ سے میں آپ کا ٹیسٹ نہیں دے سکا۔“

”کوئی بات نہیں بیٹا! مجھے معلوم ہے آپ کا قابل اور ذمے دار طالب علم ہیں۔ آپ آج پی ٹی کے پیئرڈ میں مجھے ٹیسٹ دے دینا۔“ سراسحاق نے شفقت سے کہا۔

استاد کا مشفق رویہ محسوس کر کے عامر بہت خوش تھا۔ رہ رہ کر عدنان پر غصہ آ رہا تھا۔ خوانخواہ مجھ ڈرا دیا۔



ثریا پھو گھر آئی ہوئی تھیں۔ باتوں باتوں میں ثانیہ خالہ کا ذکر چل نکلا۔ انھوں نے بتایا: ”ثانیہ اور اس کے گھر والے ناران کا غان سیر پر جا رہے ہیں۔ پورا ایک مہینے کا پروگرام ہے۔ خوب گھومیں پھریں گے۔“

امی جان نے کہا: ”اوہو، ہمیں تو اس اتوار ان کی بیٹی کی میٹرک میں کامیابی پر مبارک دینے کے لیے ان کے گھر جانا تھا۔“

”اب مہینے بعد جانے کا پروگرام بنانا۔“ ثریا پھو نے مفت مشورہ پیش کیا۔

اتفاقاً تین دن بعد ایک تقریب میں امی جان کا ثانیہ خالہ سے آ مناسا منا ہوا۔ حال احوال کے بعد امی جان نے کہا: ”سنا ہے آپ سب لوگ ناران کا غان گھومنے پھرنے جا رہے ہیں۔ چلو اچھا ہے۔ ایک مہینا خوب گھوم پھر لینا۔“

ثانیہ خالہ نے حیران ہو کر کہا: ”کہاں کی سیر، کیسی سیر، میرے چھوٹے بیٹے کو سخت بخار اور نزلہ زکام ہے۔ ابھی اس کو بڑی بیٹی کے پاس چھوڑ کر مشکل سے آئی ہوں۔ ایسی حالت میں ہم کہیں نہیں جاسکتے۔ آپ کو کس بے وقوف نے یہ بات بتائی ہے۔“

امی نے شرمندگی سے کہا: ”کسی سے سنا ہے کہ آپ لوگ ایک مہینے کے لیے ناران کا غان جا رہے ہیں۔“

”ناران کا غان کا ٹرپ تو ہم گرمی کی چھٹیوں میں بنائیں گے، وہ بھی ایک ہفتے کے لیے جائیں گے، ایک مہینے کے لیے نہیں۔“ ثانیہ خالہ مسکرا کر بولیں۔

امی جان بے چاری کافی شرمندہ ہوئیں۔

تو ساتھیو! کسی کی باتوں پر بغیر تصدیق کیے یقین کرنے کا یہ انجام ہوتا ہے۔ کسی بھی بات کو آگے بڑھانے سے پہلے اس کی تصدیق ضرور کرنی چاہیے، تاکہ بعد میں پچھتاوا یا شرمندگی نہ ہو۔

دودھ پیئیں، خوب جیئیں

اس انمول نعمت میں
کیلشیم، پروٹین اور بہت سے
معدنی اجزاء شامل ہیں

دودھ کا روزانہ استعمال
اچھی صحت، بیدار ذہن
اور خوشگوار زندگی کی

زمانت ہے

دودھ پینے کو

اپنی عادت کا حصہ بنائیے

اشتہار برائے آگہی

ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان

کہانی نمبر ۱

سیدھے کا اُلٹا

شکیل صدیقی



مجھے عقیل کہتے ہیں اور میں ساتویں جماعت کا طالب علم ہوں۔ آج کل میرے سالانہ امتحان ہو رہے ہیں۔ آج منگل ہے اور میرا اردو کا پرچہ ہے۔ میں نے پوری تیاری کر لی ہے۔ جی ہاں! میں فرسٹ آؤں گا۔ جب وین آنے کا وقت ہوا تو میں نے ڈریس پہننا شروع کیا۔ پتا



کہانی نمبر ۲

محنت کا جادو

عرفان الحق



دور دراز کے کسی قصبے میں ایک محنتی لکڑہارا رہتا تھا۔ وہ دن بھر کڑی محنت سے قریبی جنگل میں لکڑیاں کاٹا کرتا تھا۔ شام ہوتے ہی وہ کٹی ہوئی لکڑیاں قصبے کے بازار میں بیچ آتا۔ ان لکڑیوں کے بدلے اسے جتنے پیسے ملتے وہ بہت زیادہ تو نہ ہوتے تھے، مگر سادہ مزاج لکڑہارے اور اس کی

چلا کہ پتلون کی زپ خراب ہو گئی ہے۔ دوسری پتلون کھوٹی پر لٹکی ہوئی مل گئی، لیکن ماسی نے اسے دھویا نہیں تھا۔ سخت بدبو آ رہی تھی۔ داغ دھبے پڑے ہوئے تھے۔ دراصل اس میں میرا کوئی قصور نہ تھا۔ میں پانچ چھ لڑکوں کے ساتھ گلی میں کرکٹ کھیل رہا تھا کہ گیند سامنے والے ورک شاپ میں چلی گئی۔ میں گیند لینے چلا گیا۔ گیند تو مل گئی، لیکن مکینک لڑکے نے شرارت میں اپنے ہاتھ میری پتلون پر رگڑ دیے۔ اسکول کی پتلون میں نے اس لیے پہن لی تھی کہ کل ماسی آئے گی تو دھودے گی، لیکن ماسی نے چھٹی کر لی۔

اُف کہاں جاؤں؟ کیاں کروں؟ یاد آیا کہ امی زپ درست کر لیتی ہیں۔ پہلے بھی کئی بار درست کر چکی ہیں۔ میں نے باورچی خانے میں جا کر کہا: ”امی! پتلون کی زپ خراب ہو گئی ہے۔“
 ”تو میں کیا کروں؟“ انھوں نے ڈانٹنے والے انداز سے کہا: ”رات کو اپنا یونی فارم چیک کر لینا



بیوی کی گزر بسر کے لیے کافی ہوتے۔ دونوں میاں بیوی کے ہاں کوئی اولاد نہیں تھی جس کی کمی دونوں کو بہت محسوس ہوتی تھی اور وہ نیک اولاد کے لیے اللہ میاں سے دعائیں مانگتے رہتے تھے۔ بچوں کی غیر موجودگی انھیں افسردہ بھی کر دیا کرتی تھی، مگر اسے اللہ کی رضا جان کے مطمئن ہو جایا کرتے تھے۔ لکڑ ہارے نے گھر کا سونا پن دور کرنے اور اپنی بیوی کا دل بہلانے کے لیے ایک تو تا پال رکھا تھا۔ تو تے کی ٹیں ٹیں اور بول چال چھوٹے سے گھر میں رونق لگائے رکھتی تھی۔ لکڑ ہارے کی بیوی اس تو تے سے بے حد پیار کرتی تھی۔ اس تو تے کی ایک خاص بات یہ بھی تھی کہ اس کے پروں میں سے دو چمکتے ہوئے پُرسنہرے رنگ کے بھی تھے۔ ان پروں کی چمک اتنی تھی کہ وہ سونے کے معلوم ہوتے تھے۔ اس خوبی نے اس تو تے کی خوب صورتی میں چار چاند لگا دیے تھے۔ سارے قصبے میں لکڑ ہارے کے اس تو تے کی دھوم تھی۔ بہت سے لوگوں نے لکڑ ہارے اور اس کی بیوی سے اس تو تے کو منھ مانگے داموں میں

چاہیے تھانا؟“ وہ ابو کے لیے ناشتا بنا رہی تھیں، اس لیے کوئی بات سننے کو تیار نہیں تھیں۔
بات تو وہ ٹھیک کہہ رہی تھیں، مگر اس وقت تو دیر ہو رہی تھی۔ اسکول کی وین آ جاتی تو مصیبت
آ جاتی۔

”امی! آج میرا پرچہ ہے نا! بس آپ زپ صحیح کر دیجیے۔“
”اپنی باجی سے کرا لو۔“

میں دوڑا ہوا ان کے پاس گیا تو ننھے کے ساتھ لوڈ وکھیل رہی تھیں۔
”باجی! میرے پتلون کی زپ خراب ہو گئی ہے۔“ میں نے رو دینے والی آواز میں کہا۔
”اچھا میرے پاس رکھ دو۔ میں اپنی گیم ختم کر لوں، اس کے بعد درست کر دوں گی۔ وین تو دیر
سے آتی ہے نا؟“



خریدنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا، مگر دونوں میاں بیوی اس تو تے کو اپنی اولاد کی طرح پیار کرتے تھے،
اس لیے انھوں نے تو تے کو فروخت کرنے سے صاف انکار کر دیا۔
اس قصبے میں رحمونا کا ایک لڑکا بھی رہتا تھا۔ جو قصبے کے واحد حلوائی کا اکلوتا، مگر تلمبا بیٹا تھا۔ حلوائی کی
شدید خواہش تھی کہ رحمونا کو بار بار میں اس کا ہاتھ بٹائے، مگر رحمونا کام دن بھر شیخیاں بکھارنا اور جادوئی
کہانیاں پڑھنا تھا۔ جادوئی کہانیاں پڑھ کر وہ اپنے آپ کو بھی کسی طلسمی کہانی کا کردار سمجھنے لگا تھا
اور کسی جادوئی ذریعے سے پیسے کمانا اس کی زندگی کا واحد مقصد بن کر رہ گیا تھا۔ اس نے جانے کہاں
سے سن لیا کہ لکڑہارے کا تو تا کوئی عام تو تا نہیں ہے، بلکہ یہ ایک جادوئی تو تا ہے۔ اس کے دونوں
سنہرے پروں کو روشنائی میں ڈبو کر مخصوص طریقے سے جو بھی لکھا جائے گا وہ سچ ہو جائے گا۔ جو تصویر
بنائی جائے گی وہ حقیقت کا روپ دھار لے گی۔ یہ سب کچھ جانتے ہی وہ لکڑہارے اور اس کی بیوی

”نہیں، آج جلدی آئے گی۔ آج تو پرچہ ہے نا؟ پرسوں تو وین کا ٹائر پنچر ہو گیا تھا، اس لیے وہ دیر سے آئی تھی۔“ میں نے وضاحت کی۔

”اچھا ٹھیک کیئے دیتی ہوں، بابا! تم جا کر سوئی دھاگے کا ڈبالے آؤ۔“

میں دوڑتا ہوا دوسرے کمرے میں گیا اور سلائی مشین کی دراز سے ڈبائ نکال کر لے آیا۔ باجی نے ڈبے سے بلیڈ نکال کر سلائی کاٹ دی اور زپ نکال دی۔ زپ رواں ہو گئی۔ اب انھیں زپ کے دونوں کناروں کی سلائی کرنا تھی، جو ہاتھ کا کام تھا۔ انھوں نے ابھی پہلا ٹانگا لگایا تھا کہ سوئی ان کی انگلی میں چھب گئی۔ تھوڑا سا خون بھی نکل آیا۔ میرے ساتھ بھی کئی بار ایسا ہوا تھا، مگر میں نے کبھی کوئی پروا نہیں کی۔ اس وقت نہ جانے کیا ہوا، باجی نے تو وہ اُدھم مچا دیا جیسے کسی نے ان کی انگلی پر چھری پھیر دی ہو۔



کے پیچھے پڑ گیا کہ وہ کسی نہ کسی طرح تو تا اس کے ہاتھ فروخت کر دیں، مگر دونوں نے ہمیشہ کی طرح اس بار بھی صاف انکار کر دیا۔ ان کے اس حد درجہ انکار نے رجمو کا شک یقین میں بدل دیا کہ ہونہ ہو یہ تو تاجادوئی تو تا ہے، جیسی یہ لوگ اسے کسی قیمت پر فروخت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

اب حال یہ تھا رجمو تو تا حاصل کرنے کے لیے دن بھر مختلف منصوبے بناتا رہتا تھا۔ بہت سوچ بچار کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ اس تو تے کو چرائے بغیر کوئی اور طریقہ نہیں ہے۔ لکڑہارے کے گھر کی دیوار زیادہ اونچی نہیں تھی۔ رجمو کے خیال میں رات کے اندھیرے میں وہ آسانی سے اس دیوار کو پھلانگ کر تو تے کا پنجرہ اُٹھا کے لاسکتا تھا۔ تو تے کے شور سے بچنے کے لیے اس نے دو تین ہری مرچیں بھی رکھ لیں تھیں۔

ایک رات جب سب گہری نیند سو رہے تھے، رجمو اپنے گھر سے نکلا۔ اس نے کالے رنگ کا چست لباس پہن رکھا تھا۔ جس نے اسے تاریکی کا حصہ بنا دیا تھا۔ سارا قصبہ سنسان پڑا تھا دور دور تک

”ہائی اللہ! یہ کیا ہو گیا؟“ اس کے سوا ان کے منہ سے کچھ نکل ہی نہیں رہا تھا۔ ”ادنیٰ میں مر گئی۔“
 ”باجی! کچھ نہیں ہوا۔ تل پر جا کر ہاتھ دھولیں۔“ میں نے ہمدردی سے کہا۔

”میں نہیں لگا رہی زپ۔“ انھوں نے جھنجھلا کر کہا اور پتلون ایک طرف پھینک دی۔

میں نے باورچی خانے کا رخ کیا اور امی سے باجی کی شکایت کر دی۔ امی نے کہا کہ وہ ناشتا تیار کر چکی ہیں۔ خود لگا دیں گی۔ میں نے سوچا جب تک اپنی ڈیبا چیک کر لوں۔ اس میں بال پوائنٹ، پنسل، ربڑ اور شاپر ہے یا نہیں۔ ڈیبا کھولی تو اس میں بال پوائنٹ نہیں تھا۔ حال آں کہ میں نے رات ہی کورکھا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ ارسلان لے گیا ہوگا۔ جب اس کی کوئی چیز گم ہو جاتی ہے تو وہ میری ڈیبا سے نکال لیتا ہے۔ وہ اسکول جا چکا تھا۔ اب میں کہاں جاؤں؟

میں نے امی سے پیسے لیے اور دوڑتا ہوا دوکان تک گیا۔ دوکان بند تھی۔ پھر گھر کی طرف دوڑا،



کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ احتیاط سے چلتا ہوا لکڑہارے کے گھر جا پہنچا۔ آگے پیچھے نظر دوڑا کروہ جھٹکے سے دیوار پر چڑھ گیا، مگر جب دوسری طرف اُترنا چاہا تو ایک دم اس کا پاؤں پھسلا اور زور دار آواز کے ساتھ رجمو لکڑہارے کے صحن میں جا گرا۔

لکڑہارا صحن میں نبجھی ہوئی چار پائی پر سو رہا تھا۔ وہ رجمو کے گرنے کی زوردار آواز سے آنکھیں ملتا ہوا جاگ اُٹھا۔ حواس بحال ہونے پر کیا دیکھتا ہے کہ گھر کے صحن میں ایک اجنبی شخص سر سے لے کر پاؤں تک کالے کپڑوں اور چہرے پر نقاب ڈالے پڑا کر رہا ہے۔ لکڑہارے نے چور چور، کا شور مچا دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے آس پاس کے گھروں سے لوگ ڈنڈے لے کر لکڑہارے کے گھر میں داخل ہو گئے۔ چور کو دیکھ کر غصہ تو سب کو بہت آیا، مگر اس کی یہ حالت اور درد بھری صدائیں سن کر اس چور کو اُٹھایا اور چار پائی پر لٹا کر اس کا نقاب اُلٹ دیا۔

ایک اور بچے سے ٹکرا گیا جو اسٹیل کی چھوٹی بالٹی میں دودھ لے کر آ رہا تھا۔ دھکا لگنے سے دودھ گر پڑا اور سڑک سفید ہو گئی۔ وہ مرنے مارنے پر تل گیا۔ میں نے دو تین بار معافی مانگی تو کہیں جا کر جان چھوٹی۔ اب دوڑنے کے بجائے اطمینان سے چلنے لگا، گھر کے قریب پاؤں پھسلا تو سڑک پر گر پڑا۔ وہ کیلے کا چھلکا تھا، جو کسی بدتمیز اور گنوار لڑکے نے پھینکا تھا۔ پھر یاد آیا کہ شام کو میں نے بھی تو ٹھیک اسی جگہ کھڑے ہو کر کیلے کھائے تھے۔ ممکن ہے وہ چھلکے میں نے ہی پھینکے ہوں۔

اچھا اب چھلکوں کے بجائے بال پوائنٹ کے بارے میں سوچنا چاہیے۔ گھر پہنچ کر باجی سے کہا تو انھوں نے اپنا پرس کھول کر چمکیلا والا بال پوائنٹ مجھے دے دیا۔ چمکیلا بال پوائنٹ دیکھ کر ننھا مچل گیا اور ضد کرنے لگا کہ میں بال پوائنٹ سے لکھوں گا۔ چمکیلا بال پوائنٹ مجھے دو۔ میں نے بال پوائنٹ اپنی ڈبیا میں رکھا اور ڈبیا جا کر اپنے کمرے میں گدے کے نیچے چھپا دی۔ پھر اسٹور میں



نقاب کا اُلٹنا تھا کہ رمحو کا چہرہ سب کے سامنے آ گیا۔ لوگوں پر حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ چھوٹے سے قصبے میں سب لوگ ایک دوسرے سے واقف ہوتے ہیں۔ رمحو کے ابا سب کی نظر میں ایک شریف انسان تھے، کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ان کا بیٹا رمحو اس طرح چوری کرتے ہوئے پکڑا جائے گا۔ رمحو کا بھی شرم اور درد سے حال بُرا تھا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سا جائے، تاکہ اسے لوگوں اور اپنے ابو کا سامنا نہ کرنا پڑے، مگر اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیا چگ گئی کھیت۔

اس کے والد کو گھر سے بلوایا گیا۔ وہ آئے اور غصے میں لگے اس کو مارنے پٹینے۔ بڑی مشکل سے قصبے والوں نے رمحو کو بچایا۔ سب اس کی اس گھٹیا حرکت کی وجہ جاننا چاہتے تھے۔ پہلے تو ندامت کے مارے رمحو کی آواز نہ نکلی، مگر جب لوگوں کا دباؤ بڑھا اور پولیس کو بلائے جانے کی دھمکی دی گئی

جا کر اسکول ڈریس پہنا۔ چوں کہ میرے جوتوں میں تسمہ ہے، میں نے اسے گسنے کے لیے زور لگایا تو تسمہ ٹوٹ کر ہاتھ میں آ گیا۔ یاد آیا کہ ایک جوڑی تسمہ فالتو ہے، مگر کہاں ہے؟

ذہن پر زور ڈالا تو یاد آیا کہ ننھے نے کل رات کو دونوں تسمے آپس میں باندھ کر لمبا کر لیا تھا، پھر اس سے اپنے کھلونا اونٹ کی گردن باندھ دی تھی اور اونٹ کو صحن میں دوڑاتا پھر رہا تھا۔ اونٹ پانی کی بالٹی میں مل گیا۔ ننھا اسے رات کو نہلا رہا تھا۔ پھر پتا نہیں کیا ہوا کہ اس نے اونٹ کو پانی میں ڈبو دیا۔ میں نے اس کی گردن سے تسمہ کھولا اور جوتے میں ڈال لیا۔ وہ گھبرا گیا تھا، اس لیے دشواری ہوئی۔ بہر حال اب پاؤں سے جوتے کے نکلنے کا اندیشہ نہیں تھا۔

ابو کے ساتھ ناشتا کیا۔ اسکول کی وین آنے میں صرف دس منٹ رہ گئے تھے۔ وین آگئی تو میں نے ڈبیا بستر کے نیچے سے نکالی اور وین میں سوار ہو گیا۔ امتحان ہال میں بیٹھنے سے پہلے میں نے اپنے دوست شجاع کو بتایا کہ میں نے آج اردو کے پرچے کی تیاری اچھی کر لی ہے، اُمید ہے کہ



تو ناچار رحمونے اپنا منہ کھولا اور اپنی بے وقوفی کا سارا ماجرا قصے والوں کو سنا ڈالا۔ رحموی بات سن کر کچھ لوگ تو ہتھلہ لگا کر ہنس پڑے اور رحمو کا مذاق اڑانے لگے، جب کہ کچھ لوگ، جو اب بھی بھوت پریت اور جادو ٹوٹے کو حقیقت مانتے تھے، وہ اس بات کو آ زمانے کا مشورہ دینے لگے۔ لکڑہارا اور اس کی بیوی اس بات کے سختی سے مخالف تھے، کیوں کہ اس سے ان کے توڑے کو تکلیف پہنچتی، مگر جب سب کا اصرار بہت بڑھا تو انھیں بھی اجازت دینا پڑی۔

قینچی لائی گئی اور توتے کی ٹیٹیں ٹیٹیں کی پروانہ کرتے ہوئے اس کے دونوں سنہرے پردوں کو کتر دیا گیا۔ پڑوس کے گھر سے روشنائی لاکر، رحمو کو دیے گئے کہ وہ وہ جس طرح چاہے، اپنی اور مجمع میں موجود اپنے جیسے دوسرے لوگوں کی تسلی کر لے۔ رحمونے ایک چھوٹا سا پرندہ بنایا اور انتظار کرنے لگا کہ کب اس کے بنائے ہوئے پرندے میں جان آئے اور آسمانوں میں اڑتا چلا جائے، مگر کافی دیر بعد بھی اس تصویر میں

میں فرسٹ آؤں گا۔ میری بات سن کر وہ ہنسنے لگا۔ مجھے بُرا لگا۔ میں نے کہا کہ جب زلزلہ آئے گا، تب دیکھنا۔ وہ ہنسا اور ہنستا چلا گیا۔ جب ٹیچر نے پرچہ دیا تو میں رونے لگا اور روتا ہی چلا گیا۔ اس لیے کہ اس دن اردو کے بجائے سوشل اسٹڈیز کا پرچہ تھا۔ میں نے آنسو پونچھ کر کسی نہ کسی طرح سے پرچہ حل کیا۔ سوشل اسٹڈیز مجھے آتی نہیں تھی، مگر جتنی آتی تھی وہ لکھ دی۔ جی ہاں! اُمید ہے کہ اب میں امتحان میں بُرے نمبروں سے فیل ہو جاؤں گا۔ گھر آ کر میں نے کسی کو نہیں بتایا کہ پرچہ کیسا ہوا ہے، بلکہ اسے چھپا کر تنکے کے نیچے رکھ دیا۔

میز کی دراز کھول کر سالانہ امتحان کی ڈیٹ شیٹ دیکھی۔ اس میں بھی سوشل اسٹڈیز لکھا تھا۔ تو پھر کیا بات تھی؟ ششما ہی امتحان کی ڈیٹ شیٹ میں نے بہت سنبھال کر میز کی اسی دراز میں رکھی ہوئی تھی، کیوں کہ میں اس امتحان میں فرسٹ آیا تھا۔ اسے دیکھا تو اس میں آج کے دن اردو کا پرچہ لکھا تھا۔ اتفاق سے تاریخ آج ہی کی تھی، البتہ مہینہ بدلا ہوا تھا۔ امتحان کی تیاری میں نے اسی ڈیٹ شیٹ کو دیکھ کر کر ڈالی تھی۔



کسی قسم کے زندگی کے آثار نظر نہ آئے تو رحموی پشیمانی اور بھی بڑھ گئی۔ جادو وغیرہ کے چکر میں پڑ کر اپنی اور اپنے والد کی عزت ہمیشہ کے لیے گنوا دینے کا احساس اس پر حاوی ہونے لگا۔ رجمو پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے لکڑ ہارے کے قدموں میں گر پڑا اور معافی مانگنے لگا۔ لکڑ ہارے نے اسے اٹھا کر گلے سے لگالیا۔ اس کے آنسو پونچھ کر کہنے لگا کہ بیٹا! تم میرے چھوٹے بھائی کی طرح ہو، اس لیے معافی مانگنے کی تو کوئی ضرورت نہیں، مگر میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا۔ اصل جادو انسان کے اندر ہوتا ہے اور وہ ہے محنت کا جادو۔ اپنے بازؤں کے زور پر حاصل کی گئی دولت چاہے جتنی بھی کم ہو، مگر اس میں برکت اور سکون دنیا کے کسی بھی خزانے سے زیادہ ہوتا ہے۔ لکڑ ہارے کی سیدھی سچی باتوں نے رحموی آنکھیں کھول دیں۔ وہ آگے بڑھ کر اپنے والد کے گلے لگ گیا اور ان سے معافی مانگ کر اس نے آئندہ ان کا دست و بازو بننے کا عہد کیا اور محنت سے روزی کمانے لگا اور محنت کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا اصول بنالیا۔

معلومات افزا

س-ف

درج ذیل ۱۰ سوالات کے جوابات ۱۵ دسمبر ۲۰۱۹ء سے قبل بھجوادیں۔ جواب کے ساتھ کوپن کا آنا ضروری ہے۔ تمام درست جواب دینے والے پندرہ نو نہال انعام کے حق دار ٹھہریں گے۔ تعداد زیادہ ہونے کی صورت میں انعام کا فیصلہ قمر اندازی کے ذریعے کیا جائے گا۔

- ۱ ”ابوالانبیاء“..... کو کہا جاتا ہے۔ (حضرت آدمؑ - حضرت ابراہیمؑ - حضرت نوحؑ)
- ۲ فجر کی اذان میں ”الصلوٰۃ خیر امن النوم“ کا اضافہ..... کی تجویز پر ہوا۔
- ۳ گوادر..... میں پاکستان کا حصہ بنا۔ (۱۹۳۸ء - ۱۹۵۱ء - ۱۹۵۸ء)
- ۴ پاکستان میں پہلا ٹی وی اسٹیشن..... میں قائم ہوا۔ (ڈھاکا - کراچی - لاہور)
- ۵ بابائے معاشیات..... کو کہا جاتا ہے۔ (ایڈم اسمتھ - کارل مارکس - ٹامس لٹھس)
- ۶ بچوں کے ادب میں سب سے نمایاں مقام..... کو حاصل ہے۔
- ۷ ”.....“ وہ دھات ہے جس پر تیزاب اثر نہیں کرتا۔ (ایلیومینیم - پلاٹینیم - کرومیم)
- ۸ جرمن چانسلر اڈولف ہٹلر..... میں پیدا ہوا۔ (فرانس - اٹلی - آسٹریا)
- ۹ اردو زبان کا ایک محاورہ یہ ہے: ”آنکھوں پر..... پڑ جانا۔ (دھول - دھوپ - پردہ)
- ۱۰ معروف شاعر سیب اکبر آبادی کے اس مشہور شعر کا دوسرا مصرع مکمل کیجیے:

عمر دراز مانگ کے لائی تھی چار دن دو آرزو میں..... گئے، دو انتظار میں (گزر - کٹ - چلے)

کوپن برائے معلومات افزا نمبر ۲۸۸ (دسمبر ۲۰۱۹ء)

نام : _____
پتا : _____
عمر : _____ تعلیم : _____

کوپن برائے بلا عنوان انعامی کہانی (دسمبر ۲۰۱۹ء)

عنوان : _____
نام : _____
پتا : _____
عمر : _____ تعلیم : _____

کوپن برائے نام بوجھیے (دسمبر ۲۰۱۹ء)

نام شخصیت : _____
نام نونہال : _____ عمر : _____ تعلیم : _____
پتا : _____

ایک کوپن، ایک نونہال کے لیے ہے۔ ایک ہی عنوان لکھیے۔
اپنا پتا صاف اور خوش خط لکھیے۔ کوپن کو A4 سائز کے کاغذ پر چپاں کیجیے اور
۱۵ دسمبر ۲۰۱۹ء تک بھجوادیتجیے۔

ہمدرد فری موبائل ڈسپنسری

ہمدرد فری موبائل ڈسپنسری ہمدرد فاؤنڈیشن کے فلاحی کاموں کا ایک حصہ ہے۔ ہر مہینے پورے پاکستان میں ہزاروں مریضوں کا مفت طبی معائنہ کرنے کے بعد مفت ادویات بھی دی جاتی ہیں۔ یہ فری موبائل ڈسپنسریاں کراچی، لاہور، ملتان، بہاول پور، فیصل آباد، سرگودھا، راولپنڈی، پشاور، کوئٹہ، سکھر، حیدر آباد اور آزاد کشمیر میں مستحق مریضوں کے لیے مخصوص ہیں۔

کراچی کے لیے چھ گاڑیاں درج ذیل علاقوں میں خدمت پر مامور ہیں
غازی آباد، گلشن بہار، اورنگی نمبر 13، قائم خانی کالونی، بلدیہ ٹاؤن، نیوکراچی سیکٹر D-11، سیکٹر F-11، نئی آبادی، یوسف گوٹھ، لیاری ایکسپریس وے، خدا کی بستی، کورنگی نمبر 2، کورنگی سو کوارٹرز، کورنگی نمبر 4، ونگی گوٹھ، محمود آباد، عمر گوٹھ، ایوب گوٹھ، مدرسہ انوار الایمان، سلطان آباد، مدرسہ منبع العلوم، وھیل کالونی، اکبر گراؤنڈ، مہاجر کیپ، بلدیہ ٹاؤن نمبر 3، شفیع محلہ (لال مسجد)، نور شاہ محلہ، مواچہ گوٹھ، بلدیہ ٹاؤن نمبر 7، مشرف کالونی بلاک سی، ایف، ای اور اے روڈ، لیاقت آباد پیلی کوٹھی، کوثر نیازی کالونی، مجید کالونی اور ملیر۔



جوابات معلومات افزا - ۲۸۶

اکتوبر ۲۰۱۹ء میں شائع ہونے والے معلومات افزا - ۲۸۶ کے درست جوابات ذیل میں لکھے جا رہے ہیں۔ اس بار تمام درست جوابات دینے والے نوہالوں کی تعداد ۱۵ سے زیادہ تھی، اس لیے قرعہ اندازی کر کے ۱۵ نام نکالے گئے۔ ان نوہالوں کو ایک ایک کتاب روانہ کی جائے گی۔ باقی نوہالوں کے نام شائع کیے جا رہے ہیں۔

- ۱۔ حضرت نوحؑ کے بیٹوں میں سے ایک نافرمان بیٹا کنعان اپنی کافروں کے ساتھ پانی میں ڈوب گیا تھا۔
- ۲۔ غزوہ احداور خندق میں کافروں کے سردار حضرت ابوسفیانؓ تھے، جو بعد میں مسلمان ہوئے۔
- ۳۔ قدیم شہنشاہیت اب تک صرف جاپان میں قائم ہے۔
- ۴۔ انگلستان اور شمالی آئرلینڈ کے الحاق سے ۱۶۰۳ء میں سلطنت برطانیہ قائم ہوئی۔
- ۵۔ ”لسان العصر“ مشہور شاعر اکبر الہ آبادی کو کہا جاتا ہے۔
- ۶۔ مشہور کتاب ’کولتار‘ کے مصنف عظیم بیگ چغتائی ہیں۔
- ۷۔ ”Porcupine“ انگریزی زبان میں خارپشت کو کہتے ہیں۔
- ۸۔ دنیا کی واحد نگین گیس کلورین ہے جو بنزائل زرد رنگ کی ہوتی ہے۔
- ۹۔ اردوزبان کی ایک مثل ہے: ”وہم کی دو احکیم لقمان کے پاس بھی نہیں تھی۔“
- ۱۰۔ حضرت ابراہیمؑ ذوق کے اس شعر کا دوسرا مصرع اس طرح درست ہے:
اے ذوق کسی ہم دم دیرینہ کا ملنا بہتر ہے ملاقات مسیحا و خضر سے

قرعہ اندازی میں انعام پانے والے خوش قسمت نوہال

- ☆ کراچی: واینا جنید، فاطمہ تحریم، محمد سہیل تونسوی، حافظ سیف اللہ پشوری، ماہم طارق، زیر سلطان محمود۔
- ☆ تعلقہ ٹیاری: تیور جان بہلم پٹھان ☆ راولپنڈی: حسین شفیق اسلم ☆ لاہور: زین العابدین۔
- ☆ میرپور خاص: محمد بلال عزیز ☆ کالا گجراں: سیما کوثر ☆ ڈیرہ اسماعیل خان: محمد احتشام خان۔
- ☆ قلعہ دیدار سنگھ: سمیع اللہ ☆ میاں چنوں: محمد عبداللہ اعجاز ☆ جھنگ صدر: محمد عدیل حسنین۔

۱۰ درست جوابات دینے والے قابل نونہال

☆ کراچی: رباب فاطمہ، وردہ شاہ، محمد عباس شیخ، سیدہ مریم محبوب، سید شہنشاہ اظہر، سید عفاف علی جاوید، سید بشل علی اظہر، سیدہ جویریہ جاوید، سید صارم علی، غیرہ انصاری، محمد عاقب مصطفیٰ، وردہ مصطفیٰ، حسان خالد، ارسلان احمد، عائشہ احمد، نمرہ فیصل ☆ تعلقہ ٹیاری: انوشہ جان بہلم پٹھان، شیر جان بہلم پٹھان ☆ راولپنڈی: ہانیہ نور بٹ، محمد سلمان بٹ، ملک محمد احسن، شازرا احمد، محمد وقار الحسن ☆ لاہور: حفصہ سجاد، راین سجاد ☆ میرپور خاص: اسما خان ☆ حیدرآباد: سید محمد حسین شاہ، محمد یوسف قریشی، عائشہ امین عبداللہ ☆ تلہ گنگ: محمد حسان عبداللہ ☆ پھل شہر: جاوید ابراہیم پھل ☆ ڈیرہ غازی خان: علی عمران کلاچی ☆ مظفر گڑھ: احمد خاں لغاری۔

۹ درست جوابات بھیجنے والے سمجھ دار نونہال

☆ کراچی: محمد عفاف صدیقی، اُسید الرحمن، عائشہ کاشف، غلام محمد سرور، صادق، عادل امیر، رابعہ، رقیہ محمد عقیل شاہ، سیدہ ساکدہ محبوب، محمد سفیان فیصل، علینا اختر، یمنی شیخ، سیدہ ناہیدہ نرگس، عبدالرحمن عارف، محمد حذیفہ آفتاب ☆ لاہور: امتیاز علی ناز، اُسامہ ضیا ☆ ٹوبہ ٹیک سنگھ: سعدیہ کوثر مغل ☆ اسلام آباد: اشتیاق سرور اعوان ☆ نواب شاہ: ثانی زہرا ☆ حیدرآباد: سعد محمود ☆ اوکاڑہ کینٹ: محمد جہاں زیب۔

۸ درست جوابات بھیجنے والے علم دوست نونہال

☆ کراچی: شہباز خان بن سرفراز خان، عبید سرور، یمنی بنت صدیق بکر، فرحین فراز، نور العین، زینب ناز سلطان، محمد حاشر سلمان، محمد بن جواد، غیرہ طیب خان ☆ پرائما سکھر: محمد حبیب ☆ ٹیکسلا: ماہین خالد ☆ دینہ: محمد عبداللہ حسن ☆ خانیوال: محمد گورش خان ☆ لاہور: ولید اشرف ☆ ٹنڈوالہیار: آمنہ آصف کھتری۔

۷ درست جوابات بھیجنے والے ذہین نونہال

☆ کراچی: محمد عباس زاہد، مجتبیٰ احمد ☆ کوئٹہ: سید عمر ☆ گوجرانولہ: محمد شہیر یوسف ☆ میرپور خاص: محمد مزمل احمد۔

۶ درست جوابات بھیجنے والے مخلص نونہال

☆ کراچی: محمد عزیز محمد نعیم، سدرہ ہمایوں بیگ، شعیب عبدالرحیم۔

بچوں کے جمیل جالبی

رانا محمد شاہد

علم و تحقیق کے حلقے کا ایک بڑا نام ڈاکٹر جمیل جالبی تھے، جو ۱۸/۱۱/۲۰۱۹ء کو اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب ان بڑے ادیبوں میں سے تھے جو بچوں کے لیے بھی کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے تھے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کو بچپن سے ہی لکھنے پڑھنے کا شوق تھا۔ انھوں نے بچپن سے ہی کہانیاں لکھنا شروع کر دی تھیں۔ صرف ۱۲ سال کی عمر میں انھوں نے اپنی پہلی تخلیق ”سکندر اور ڈاکو“ کے نام سے کہانی لکھی، جو اسکول میں بطور ڈرامہ بھی پیش کی گئی۔ ان کی پہلی تحریر دہلی سے شائع ہونے والے رسالے ”بنات“ میں شائع ہوئی۔ سب سے پہلی کتاب ”جانورستان“ کے نام سے شائع ہوئی۔ یہ جارج آرول کے ناول کا ترجمہ تھا۔



کہا جاتا ہے کہ بڑے ادیب بچوں کے لیے لکھنا اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں، مگر ڈاکٹر جمیل جالبی اپنی تمام مصروفیات کے باوجود بچوں کے لیے کہانیاں ضرور لکھتے تھے۔ ننھے بچوں کے لیے ان کی لکھی ہوئی کہانیاں بید کی کہانیاں، بلیاں، حضرت امیر خسرو، چھن چھن چھن اور نئی گلستاں بہت مشہور ہوئیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے بچوں کے لیے فسانہ آزاد کے مزاحیہ کردار خوبی پر مبنی داستان ”خوبی پر کیا گزری“ کے عنوان سے رسالہ ”ہونہار“ کے لیے قسط وار تحریر کی۔

”خوبی پر کیا گزری“ ایک دل چسپ سلسلہ تھا۔ جسے بچے نہ صرف شوق سے پڑھتے تھے بلکہ اس کی نئی قسط کا انتظار بھی کیا کرتے تھے۔ ”حیرت ناک کہانیاں“، ”خوبی“ اور اپنی دوسری کہانیوں کی صورت میں انھوں نے بچوں کے لیے ایسا علمی ورثہ چھوڑا ہے جس سے آنے والی نسلیں سیراب ہوتی رہیں گی۔

ابتدائی عمر سے ہی انھیں کتاب لکھنے کا شوق تھا۔ ایک انٹرویو میں اپنے اس شوق کے حوالے سے ڈاکٹر جمیل جالبی کہتے ہیں: ”جب میں چھوٹا تھا تو اکثر میری پٹائی اس بات پر ہوتی تھی کہ میں کاپیاں پھاڑ کر ان سے کتاب بناتا تھا اور دوپہر کو جب سب لوگ سو جاتے تھے، میں غسل خانے میں چھپ کر کاپیوں کے ورق علیحدہ کرتا، ان سے کتاب بناتا اور اپنے کورس کی کتاب اس پر نقل کر کے اپنا نام نمایاں طریقے سے لکھ دیتا..... محمد جمیل خان۔ اس سے اباجی بہت خوش ہوتے تھے، لیکن ہمارے اسکول کے ہیڈ ماسٹر کو میری اس قسم کی سرگرمیوں سے سخت شکایت رہتی تھی۔ وہ اکثر اباجی سے شکایت کر دیتے تھے کہ یہ کاپیاں پھاڑ دیتا ہے۔“ جالبی صاحب کی اس بات سے اندازہ ہوتا ہے کہ کتاب لکھنے یا مصنف بننے کا رجحان شعوری طور پر ان میں بچپن سے موجود تھا۔

بچوں کے رسالے ہمدرد، نونہال کے مدیر مسعود احمد برکاتی بچوں کے ادب کا ایک بڑا نام تھے۔ ان کی یہ خوبی تھی کہ وہ ان نامور بڑے ادیبوں سے بچوں کے لیے بھی کچھ نہ کچھ لکھوا لیتے تھے، صرف

بڑوں کے ادب تک محدود تھے۔ یہ مسعود احمد برکاتی کا ہی کمال تھا کہ انھوں نے ڈاکٹر جمیل جالبی سے نادان بکری، ناشکرا ہرن، نادانی کی سزا، قصہ ایک بھیڑیے کا، دو دوست دو دشمن، دو چوہے اور مغرور لومڑی جیسی بہترین کہانیاں لکھوائیں اور ڈاکٹر صاحب نے بھی بڑی محبت سے وہ شاہکار کہانیاں لکھیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی بچوں کے لیے لکھنے کے ساتھ ساتھ اس فکر میں بھی مبتلا رہتے تھے کہ بچوں کے لیے بہت کم لکھا جا رہا ہے۔ اس فکر مندی کا اظہار کرتے ہوئے وہ ایک جگہ لکھتے ہیں: ”قوم کے ادیب بڑے بوڑھے اور راہبر و راہنما یہی کہتے ہیں کہ بچے قوم کا مستقبل ہوتے ہیں، لیکن جیسے وہ اپنے مستقبل سے بے پرواہ ہو گئے ہیں، اسی طرح بچوں کے مستقبل سے بھی لاتعلق ہیں۔ ہمارے ہاں بڑے بڑے لکھنے والے ہیں۔ سب ایک سے ایک طرم خاں، مگر کیا مجال کہ بچوں کا ذرا بھی خیال ہو۔ نہ ان کے لیے لکھتے ہیں، نہ ان کے لیے سوچتے ہیں۔ کہتے ہی جاتے ہیں کہ بچے قوم کا مستقبل ہوتے ہیں۔ ذرا ان سے کوئی یہ تو پوچھتے کہ قبلہ! آپ کی بات سر آنکھوں پر، لیکن آپ نے خود بچوں کے لیے کیا لکھا ہے؟ بچوں کو تو روز ایک کتاب چاہیے۔ اچھی لکھی ہوئی، اچھی چھپی ہوئی۔ تصویروں اور خاکوں سے بنی ہوئی۔ جن سے ان کی تربیت ہو، جنہیں پڑھ کر وہ سوچیں، سمجھیں۔ ان کی معلومات میں اضافہ ہو۔ ان کا ذہن کھلے اور مستقبل کے لیے وہ تیار ہو جائیں۔“

میں نے جب نیا نیا لکھنا شروع کیا تو انہی دنوں ہمدرد نو نہال میں ڈاکٹر جمیل جالبی کی کہانی ”ناشکرا ہرن“ پڑھی۔ وہ کہانی آج بھی ذہن پر نقش ہے۔ میں نے تھوڑی مشقت کے بعد لائبریری سے نو نہال کا وہ شمارہ نکالا۔ اپریل ۱۹۹۵ء کا وہ شمارہ دیکھا اور ڈاکٹر صاحب کی کہانی پھر سے پڑھی تو اپنے بچپن کا زمانہ اور بچپن کے سارے رنگ آنکھوں کے سامنے آ گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی اس مختصر سی کہانی میں ایک بڑا پیغام دیا تھا۔ یہ کہانی میں اس تحریر کا حصہ بنا رہا ہوں، تاکہ نئے



پڑھنے والے نونہال نہ صرف اس سے لطف اندوز ہوں بلکہ وہ پیغام بھی لے سکیں۔
 ”ناشکر ہرن“..... یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب بندوق ایجاد نہیں ہوئی تھی اور لوگ تیر کمان سے
 شکار کھیلتے تھے۔ ایک دن کچھ شکاری شکار کی تلاش میں جنگل میں پھر رہے تھے کہ اچانک ان کی نظر
 ایک ہرن پر پڑی۔ وہ سب اس کے پیچھے ہو لیے۔ شکاری ہرن کو چاروں طرف سے گھیر رہے تھے
 اور ہرن اپنی جان بچانے کے لیے تیزی سے بھاگ رہا تھا۔ جب وہ بھاگتے بھاگتے تھک گیا تو
 ایک گھنی انگور کی بیل کے اندر جا چھپا۔ شکاریوں نے اسے بہت تلاش کیا، لیکن اس کا کچھ پتا نہ
 چلا۔ آخر مایوس ہو کر وہ وہاں سے لوٹنے لگے۔ جب کچھ وقت گزرا تو ہرن نے سوچا کہ اب خطرہ
 ٹل گیا ہے اور وہ بے فکر ہو کر مزے سے اسی انگور کی بیل کے پتے کھانے لگا، جس میں وہ چھپا ہوا
 تھا۔ ایک شکاری جو سب سے پیچھے تھا جب وہاں سے گزرا تو انگور کی بیل اور اس کے کچھوں کو ہلتے
 دیکھ کر سمجھا کہ یہاں ضرور کوئی جانور چھپا ہے۔ اس نے تاک کر کئی تیر مارے اتفاق سے ایک تیر
 ہرن کے جا لگا اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ مرتے ہوئے ہرن نے اپنے دل میں کہا: ”اے بد بخت!
 تیری ناشکری کی یہی سزا ہے۔ مصیبت کے وقت جس نے تجھے پناہ دی تُو نے اسی پر ظلم ڈھایا۔“
 اتنے میں شکاری بھی وہاں پہنچ گئے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ وہی ہرن مرا پڑا ہے۔“



روگ ایسا پالا کہ وہ ہر ایک کی نظر میں کامل سے کامل ہو گئے۔ گویا کابل میاں۔ جب بھی کوئی کام کرنے کے لیے کہا جاتا تو فوراً ہی کہہ دیتے کہ یہ تو میں پہلے ہی کر چکا ہوں، یا میں نہیں کروں گا یا مجھے کرنا ہی نہیں آتا۔ ہاتھ پیر مارنے کی عادت جھولے میں ہی ترک کر دی تھی۔ بڑے ہونے کے بعد جو کام ان کو سکھائے گئے وہ لاڈلا ہونے کی وجہ سے سکھانے والوں کو خود ہی کرنے پڑتے تھے۔ اسکول جانے کی عمر ہوئی تو انھیں پتا چلا کہ اسکول میں امی جیسی کسی سہولت کا وجود نہیں، جو منہ میں نوالے رکھے اور جوتے کا کھلا ہوا فیتہ باندھے۔ سو بھوکے پیاسے روتے گھر پہنچتے اور امی سے خوب لاڈ اٹھواتے جیسے کوئی پہاڑ سر کر کے آئے ہوں۔

آرام اور کھانا کابل میاں کی زندگی ان دو کاموں کے گرد گھومتی تھی۔ کھانے سے پہلے آرام، آرام کے بعد کھانا اور کھانے کے بعد پھر کھانا۔ ان کو ہر قسم کی محنت سے نفرت تھی۔ جب کچھ بڑے ہوئے اور معلوم ہوا کہ دنیا میں سائنس نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ ہر کام ٹیکنالوجی کی مدد سے صرف بٹن دبا کر ہو سکتا ہے یہ جان کر تو وہ ہر قسم کے بٹنوں کے عاشق ہی ہو گئے۔ ہر وقت ان چکروں میں رہتے کہ بٹن دبائیں اور کام ہو جائے۔ صرف کھانے اور آرام کی اس بے ڈھب روش نے ان کو ایک ہی چیز دی تھی اور وہ تھا ان کا بے حساب وزن، یعنی مٹاپا۔

کابل میاں کا فرمان تھا: ”یہ سائنس اور ٹیکنالوجی کا دور ہے۔ اس میں ہر کام اُننگی کے اشارے سے ہو جاتا ہے۔ پھر باقی جسم کو تکلیف دینا دراصل ان تمام سائنس دانوں سے زیادتی ہے، جنہوں نے یہ ساری ایبادات سے انسانوں کے لیے آسانیاں مہیا کی ہیں۔“

کابل میاں کے لیے اسکول سے چھٹی کا دن ایسا ہوتا تھا جس میں وہ بستر میں غروب ہوتے تو دیکھتے جاتے، مگر طلوع نہیں ہو پاتے۔ ایسے ہی ایک چھٹی کے دن دوپہر ہونے کو آئی تھی اور کابل میاں بستر میں ڈوبے ہوئے تھے کہ امی نے پیار سے آواز دی: ”بیٹا! کامل! ہرا دھنیا تو لا دو

مجھے۔ محسن جا رہا تھا سب کچھ اسی سے منگا لیا، مگر اس وقت ہر ادھنیا منگوانا بھول گئی تھی۔‘ محسن کاہل میاں کے بڑے بھائی تھے۔ کاہل میاں کی کاہلی پہ سخت چوٹ پڑی کہ نرم گرم بستر سے نکل کر سبزی والے کے ٹھیلے تک جائیں تو کیسے جائیں۔ سو بستر میں کسمساتے ہوئے لحاف منھ سے سرکایا اور ارشاد فرمایا: ’’امی! کیا ہرے دھینے کے بغیر کھانا نہیں پک سکتا؟ سائنس نے اتنی ترقی کر لی ہے اور آپ ہیں کہ کھانا پکانے کے لیے ہرے دھینے کی محتاج ہیں؟‘‘

امی جھنجھلا اٹھیں، لیکن بیٹا لاڈلا تھا۔ اس کے قریب آ کر نرمی سے بولیں: ’’بیٹا! ہر ادھنیا اور پودینے سے رائیہ بنانا ہے۔ پودینہ تو فرج میں رکھا ہے۔ تم جانتے ہو کہ تمہارے ابو اور بھائی رائیہ کے بغیر بریانی نہیں کھاتے، تمہاری پسند کی بریانی بنائی ہے۔ بس جلدی سے ہر ادھنیا لا دو میرے بچے! شاباش۔‘‘

کاہل میاں منھ پھاڑ پھاڑ کے جمائیاں لیتے ہوئے بولے: ’’کیا رائیہ دھینے پودینے کے بغیر بنانے کی کوئی جدید ٹیکنالوجی دریافت نہیں ہوئی امی!‘‘

اب تو امی کو بھی غصہ آ گیا: ’’حد کرتے ہو کامل! تم کچھ زیادہ ہی کاہل ہوتے جا رہے ہو۔ سب تمہیں کامل کے بجائے کاہل ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ اُٹھو دو پہر کے دو بجنے والے ہیں۔ تمہارے ابو اور محسن صبح نو بجے سے سائٹ پہ گئے ہیں۔ ابھی آ کر کھانا مانگیں گے مجھے دھنیا لا کر دو۔‘‘ امی نے غصے سے کامل میاں کا لحاف کھینچ لیا۔

امی! سائنس کی ترقی کے اس دور میں آپ مجھے سبزی والے کے ٹھیلے تک بھیج رہی ہیں۔ ایک معمولی سا ہر ادھنیا لانے کو؟ یہ دیکھیں موبائل پہ اب راشن شاپ ہے۔ آن لائن سبزی گوشت منگا یا جاسکتا ہے۔ صرف بٹن دبا کے ہر ادھنیا آرڈر کر سکتا ہوں۔‘‘ کامل میاں نے ہاتھ مار کے میز سے اپنا موبائل اٹھا لیا۔

امی سر پر ہاتھ مار کے کچن میں چلی گئیں۔ جب کہ کاہل میاں موبائل کے بٹن دبانے لگے۔ ویب

سائٹ میں سبزیوں کا خانہ کھول کے لگے سر کھانے کہ تمام سبزیوں کے نام انگریزی میں لکھے تھے اور کاہل میاں صرف کھانے پینے میں اوّل تھے۔ باقی ہر مضمون میں وہ پھسڈی تھے۔ ہر ادھیہا کی انگریزی دیکھنے کو گول گول کھول کے بیٹھے، لیکن کچھ سمجھ نہ پائے کہ اتنے میں امی نے آواز دی: ”کامل بیٹا! تمہارے ابو اور بھائی آگئے ہیں اور کھانا بھی لگا دیا ہے۔ آ جاؤ۔“ کھانا لگ جانے کا اعلان واحد چیز تھی جو کاہل میاں کو حرکت میں لاسکتی تھی فوری طور پہ بستر سے چھلانگ مار کر اترے اور منہ پہ چھپا کے مارنے دوڑے کہ ایسا کیے بغیر امی سے ڈانٹ کھانی لازمی تھی۔

”امی! کاہل میاں کا مٹاپا بڑھتا جا رہا ہے۔ آپ نے دیکھا تھا۔ آج وہ کرسی پہ بیٹھے تو ان کا جسم کرسی کی دونوں جانب لٹک رہا تھا۔“ دوپہر کے کھانے کے بعد کاہل میاں جب دوبارہ بستر میں ڈوب گئے تو سبز چائے پیتے ہوئے محسن بھائی نے ماں باپ سے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔

”ہاں یہی پریشانی مجھے بھی ہے۔ سوچ رہا ہوں، نئی کرسیاں بنوا لوں، ذرا بڑے سائز کی۔ بے چارہ کامل پھنس پھنسا کے بیٹھتا ہے۔ سکون سے بیٹھے گا بڑی کرسیوں پہ۔“ ابو اخبار تہ کرتے ہوئے پیار بھرے لہجے میں بولے۔

”حد ہوگئی ابو! میں کامل میاں کے مٹاپے کو کم کرنے کو کہہ رہا ہوں اور آپ ہیں کہ بڑی کرسیاں بنوا کے اس کا مٹاپا بڑھانے کے لیے مزید گنجائش پیدا کر رہے ہیں۔“ محسن بھائی نے سر تھام لیا۔

”اچھا اب تم اتنا بھی نہ گھبراؤ۔ بچہ ہے، کھانے پینے کا شوقین ہے۔ اس عمر میں بچے گولو مولو، ہی اچھے لگتے ہیں۔“ امی بھی لاڈ بھرے لہجے میں بول اُٹھیں۔

”کھانے پینے کا شوقین ہونا اور بات ہے، لیکن وہ تو اپنی جگہ سے ہل کے پانی تک نہیں پیتا۔ اتنا کھانے کے بعد بستر پہ لیٹا رہتا ہے۔ اتنی کاہلی اس کے مٹاپے کو خطرناک بنا رہی ہے۔“ محسن بھائی جھنجھلا کے بولے۔

”کل اسے لیموں کا جوس اور سونف کا پانی پلایا تھا۔ تمھاری پھپھو نے کہا تھا کہ اس سے وزن کم ہوتا ہے۔ تمھاری پھپھو کو بھی تو میرے بچے کا وزن کاٹنا ہے نا؟“ امی خفا ہو کے بولیں۔

”تو بچوں کی خالہ جان بھی تو وزن کم کرنے پہ لیکچر دے کر گئی تھیں پچھلے اتوار کو۔ وہ یاد نہیں آپ کو، جس کو سن کے میرا خون اتنا کھولا تھا کہ میرا اپنا آدھا کلو وزن گھٹ گیا تھا۔“ ابو غصے سے بولے۔

”افوہ میں تو صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ اس کو ہلانے جلانے کی کوشش کریں ورنہ وہ ہر کام مشین سے لینے کے چکروں میں ہاتھ پیر ہلانے سے بھی جائے گا۔ پھپھو ہوں یا خالہ، ہماری دشمن تو نہیں ہیں ناں، وہ کامل میاں کی بھلائی کے لیے ہی تو کہتی ہیں۔“ محسن بھائی نرمی سے بولے۔

”بس بس رہنے دو۔ آج چھٹی کے دن میرے ساتھ سائٹ کیا چلے گئے! مجھ پہ احسان جتا رہے ہو؟ محسن! تم منے سے بارہ سال بڑے ہو۔ تم دیکھنا وہ تمھاری عمر میں آئے گا تو تمھارے ذمے داریاں بھی سنبھال لے گا۔ ابھی اسے کھانے پینے اور تفریح کرنے دو۔“ ابو نے غصے میں دو ٹوک فیصلہ سنا دیا۔ امی بھی سر ہلا رہی تھیں۔ محسن بھائی خاموش ہو گئے۔ یہ ساری گفتگو چھپ کے سننے والے کاہل میاں کے تو مزے ہو گئے۔

اب کاہل میاں دن رات آرام کیا کرتے تھے۔ بٹن دبا کے اسکول پہنچنے کو گاڑی تھی۔ اس میں شیشہ بھی بٹن دبانے سے کھلتا اور بند ہو جاتا تھا۔ موبائل کے بٹن دبا کے جب جی چاہتا کھانا منگا لیا کرتے۔ خاص کر ان دنوں میں جب امی کی طبیعت خراب تھی اور وہ صرف سبزیاں پکا رہی تھیں۔ موٹے تازے کاہل میاں کو تازہ سبزیوں سے کوئی دل چسپی نہ تھی۔ ان کو لوبی، بھنڈی اور توری بالکل نہیں کھانی تھی۔ چنے اور ارہر کی دال سے ان کی جان نکلتی تھی۔ ایسے میں کاہل میاں موبائل کے بٹنوں پہ خوب پھرتی دکھا رہے تھے اور دھڑا دھڑا بازار کے پیزے، برگراور گھی اور مرچوں سے بھرپور بریانی کے آرڈر کر رہے تھے۔ اکثر چیزیں بستر پر ہی کھاتے پیتے۔ جس کی وجہ سے بستر کسی کباڑیے کا بستر معلوم ہوتا

تھا۔ جگہ جگہ سالنوں کے داغ اور برگر کے کاغذ بکھرے ہوئے تھے۔ اس گندگی میں ایک ہی چیز ترقی کر رہی تھی اور وہ تھی کاہل میاں کا مٹاپا! جودن دونی اور رات چوگنی ترقی کر رہا تھا۔

رات کو بازار کی نہاری، صبح بازار کی حلوہ پوری کے بعد اب اسکول میں بھاری بھر کم کئی منزلہ برگر خوب سارا پنیئر ڈال کے کھا رہے تھے کہ عجیب سا چکر آیا اور کاہل میاں اسکول کی کینٹین میں ہی بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ اسکول سے اطلاع ملی تو امی کے ہاتھ پیر پھول گئے اور کپکپاتے ہاتھوں سے ابو کا نمبر ملانے لگیں۔ ابو دوڑے، بھاگے آئے۔ کاہل میاں کو اسپتال پہنچایا گیا۔ جہاں ان کے ڈھیر سارے ٹیسٹ کیے گئے۔ امی، ابو اور احسن بھائی کا پریشانی سے بُرا حال تھا۔ کسی کو سمجھ نہیں آتا تھا کہ اس ننھے سے بچے پہ کیا گزری؟

پریشان صورت ڈاکٹر صاحب امی ابو کو ہوش اُڑانے والی باتیں بتا رہے تھے۔ دیکھیے، بچے کی جو عمر آپ لوگ بتا رہے ہیں۔ اس کے حساب سے بچے کا وزن بہت زیادہ ہے۔ بچے کے خون میں چکنائی اتنی بڑھ گئی ہے کہ اتنا چھوٹا بچہ بھی خدا نخواستہ دل کا مریض بن سکتا ہے۔ آپ لوگ اس کا بازار کا کھانا بالکل بند کر دیں۔ کسی قسم کے روغنی کھانے نہ کھلائیے۔ اگلے پندرہ دن تک صرف اُبلے ہوئی لوکی پانچنے کی دال کھلائیے۔ روزانہ بچے کو صبح پیدل چلائیے اور پھر اس کے سارے ٹیسٹ دوبارہ کرائیے۔

کاہل میاں کو ہوش آیا تو ڈاکٹر کی یہ باتیں سن کر دوبارہ بے ہوش ہونے کا جی چاہا۔ ہائے اُبلے ہوئی لوکی اور چنے کی دال؟ برگر نہاری اور بریانی..... جو میرے پکے دوست تھے..... اُف..... اور صبح شام پیدل چلنا؟ یعنی اپنے پاؤں کی مدد سے چلنا پڑے گا؟ اپنے ذاتی پاؤں..... کیسے لاڈ سے رکھے تھے میں نے، مجال ہے جو گھس جائیں۔ ہائے.....

کاہل میاں ٹرسٹرس رو دیے۔ ڈاکٹر سے پوچھنے کی ہمت نہ پڑی کہ کیا کوئی ایسا بٹن بھی ہے روزانہ بستر میں لیٹے لیٹے واک کرادے؟

نونهال ادیب

نوںہال قلم کاروں کی تحریریں جو انہیں آگے چل کر یاد دلائیں گی کہ انہوں نے لکھنے کا آغاز کیسے کیا تھا



- انعم تو صیف، کراچی

- کاشف عمر

- ماہین خالد، ٹیکسلا

- وجیہہ ندیم، کراچی

- فاطمہ ناہید، کراچی

- علشہ آصف، احمد پور شرقیہ

- عبد الرحمن امجد، ملتان

حضرت عمر فاروقؓ

انعم تو صیف، کراچی



حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ مکہ مکرمہ میں پیدا ہوئے۔ آپؓ کی کنیت ابو حفص تھی۔ نبوت کے چھٹے سال ۲۷ برس کی عمر میں مشرف بہ اسلام ہوئے۔ اسلام قبول کرنے سے قبل ہی وہ ایک معزز، پڑھے لکھے، بہادر، دلیر، معاملہ فہم ہونے کے ناطے عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ انھیں رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سر ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ حق و باطل میں بہترین انداز میں تمیز کرنے والے تھے۔ اس بنا پر رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں ”فاروق“ کے لقب سے نوازا۔ ان کے اسلام لانے سے دین کو خوب تقویت و مضبوطی ملی۔ مسلمان جو پہلے چھپ کر نماز پڑھتے تھے۔ حضرت عمرؓ کے قبول اسلام کے بعد مسجد الحرام میں اعلانیہ نماز

کرا نے لگے۔

حضرت علیؓ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ میرے علم کے مطابق ہر ایک نے چھپ کر ہجرت کی، صرف عمر بن خطابؓ ایسے ہیں جنھوں نے علیؓ الاعلان ہجرت کی۔ انھوں نے باقاعدہ کفار کو لاکارا کہ کوئی انھیں ہجرت سے روک سکتا ہے تو روک لے، لیکن عمرؓ سے لڑنا اپنی جان کو خطرے میں ڈالنے کے برابر تھا۔

کفار ان سے خوف کھاتے تھے اور انھیں اللہ پاک کا خوف رہتا۔ کثرت سے رونے کی وجہ سے چہرے پہ دوسیاہ لکیریں سے بن گئی تھیں۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ کی وفات کے بعد آپؓ ہی مسلمانوں کے خلیفہ بنے۔ حضرت ابو امامہ سہیل بن حنیفؓ فرماتے ہیں کہ ایک زمانے تک حضرت عمرؓ نے بیت المال سے کچھ نہ لیا۔ ان پر تنگی اور فقر و فاقہ کی نوبت آگئی تو انھوں نے حضورؐ کے صحابہ کرام کو بلا کر ان سے مشورہ لیا۔

حضرت علیؓ نے کہا: ”آپؓ دو پہر اور رات کا دو وقت کا کھانا لے لیا کریں۔“ چنانچہ آپؓ نے حضرت علیؓ کے مشورے پر عمل کیا۔ زمانہ خلافت میں ایسا اونی جبہ پہنتے تھے جس میں چہرے کے پیوند لگے ہوتے تھے۔ گرمیوں میں ایک جوڑا پہنتے۔

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک مرتبہ زمانہ

آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”میرے بعد اگر کوئی نبی ہوتا تو وہ عمر ہوتے۔“ (مسند احمد)

ذوالحجہ کے آخری دنوں میں ایک دن فارسی غلام ابو لولو نے آپؐ پر دورانِ نماز حملہ کیا۔ چند دن زخمی رہ کر انھوں نے جس ہجری کلینڈر کا آغاز کیا، اس کی یکم تاریخ کو ہی شہید ہو کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی لحد مبارک کے برابر میں دفن ہوئے۔

آپؐ کو دیکھا جا رہا ہے

کاشفِ عمر



کاشان نیک، مگر غریب والدین کی اولاد تھا۔ اس کے ابو سارا دن کام کاج کے سلسلے میں گھر سے باہر ہوتے۔ شام کو تھکے ہارے آ کر چار پائی پر گر جاتے، لیکن امی نے اس کی خوب اچھی تربیت کی تھی، لیکن پھر نہ جانے کیا ہوا کاشان روز بروز بگڑتا جا رہا تھا۔ یہ

خلافت میں حضرت عمرؓ کو دیکھا۔ انھوں نے اپنے دونوں کندھوں کے درمیان اوپر نیچے تین پیوند لگا رکھے تھے۔ آپؐ چاہتے تو بیت المال میں سے خوب لے کر اپنی ذات پر خرچ کرتے، لیکن یہ ان کی عسکری و خاکساری تھی جو امیر المومنین ہونے کے باوجود سادہ زندگی گزاری۔

یہ وہ خلیفہ تھے جن کی ۲۲ لاکھ مربع میل (تقریباً آدھی دنیا) پر حکومت تھی۔ آپؐ کے دورِ حکومت میں جن ملکوں اور علاقوں کو فتح کر کے ان پر اسلام کا پرچم لہرایا گیا، ان میں عراق، شام، دمشق، حمص، یرموک، بیت المقدس، کساریہ، نکریت، خوزستان، آذربائیجان، تہرستان، آرمینیا، فارس، کرمان، سیستان، مکران، خراسان، مصر، سکندریہ سمیت دیگر علاقے شامل ہیں۔ اتنے عظیم خلیفہ کا نہ کوئی پروٹوکول، نہ حاکموں جیسے ناز و نحرے۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر میری خلافت میں ایک کتا بھی پیاسا مر جائے تو اس کے بارے میں مجھ سے پوچھ گچھ ہوگی۔

اپنی رعایا کا خیال رکھنے کا اس حد تک اہتمام فرماتے کہ راتوں کو بھیس بدل کر گشت کرتے، تاکہ لوگوں کی پریشانیوں کا علم ہو سکے۔

سب کچھ ہائی اسکول میں جانے کے بعد ہوا تھا۔ والدہ کو محسوس ہوا کہ ان کا بیٹا کسی غلط صحبت کا شکار ہو چلا ہے۔

کاشان اور امان کی ملاقات پہلی بات اسکول کی کینٹین میں ہوئی تھی۔ پھر دونوں کی دوستی حیرت انگیز طور پر بڑھتی چلی گئی۔ امان کی بُری عادتوں کے باوجود وہ امان کو چھوڑنے کے لیے آمادہ نہیں تھا۔ اسے پاؤں تلے زمین ٹکاتی تب محسوس ہوئی جب پتا چلا کہ اس کا دوست چھوٹی موٹی چیزوں کی چوری کو خاطر میں نہیں لاتا اور بے دھڑک انتہائی پھرتی کے ساتھ دوستوں کی جیبوں پر ہاتھ صاف کر لیتا ہے۔ پہلے پہل تو کاشان روک ٹوک کرتا رہا، لیکن امان ٹس سے مس نہ ہوا۔ غیر محسوس طور پر کاشان دھیرے دھیرے اس کے رنگ میں رنگنے لگا۔ دونوں مل کر جیب خرچ پورا کرنے کے لیے دوسروں کی جیبوں اور چیزوں کا صفایا کرنے لگے۔

ایک دن کاشان اور امان بائیک پر سوار ایک سپراسٹور کے سامنے تھے۔ آج دونوں کو زور کی بھوک لگی تھی۔ جیب میں ایک پائی بھی نہ تھی۔ آج دونوں نے اسکول سے بھی چھٹی کی تھی۔ بائیک ایک طرف کھڑی کی، اب دونوں کا رخ اسٹور کے دروازے کی طرف

تھا۔ اسٹور اچھا خاصا بڑا تھا۔ ہفتہ بھر پہلے بھی امان نے یہاں سے انتہائی پھرتی کے ساتھ نوڈلز کا ڈبہ بغلی جیب میں منتقل کر دیا تھا۔ دونوں اسٹور کے اندر ایسے ٹہل رہے تھے جیسے وہ کچھ خریدنے آئے ہوں۔

”میں ہاتھ صاف کروں گا تم ادھر ادھر نگاہیں دوڑانا کہیں کوئی دیکھ نہ لے۔“ امان نے کاشان کے بائیں کان میں سرگوشی کی۔

امان کے سامنے چاکلیٹ کے ڈبے پڑے تھے۔ وہ لپٹائی نظروں سے ان کو دیکھ رہا تھا۔ اگلے لمحے اس کا بایاں ہاتھ حرکت میں آیا۔ وہ ڈبا اٹھانے ہی والا تھا کہ اسے اپنا ہاتھ دبنا محسوس ہوا۔ ایک لمحے کے لیے اس کا دل زور سے دھڑکا، لیکن مڑ کر دیکھا تو کاشان اسے آنکھ کے اشارے سے روک رہا تھا اور ساتھ ہی کن نگھیوں سے چھت کی طرف دیکھنے کو کہا۔ جیسے ہی امان نے نگاہ اٹھائی وہ کانپ کر رہ گیا۔ دونوں کیمرے کی آنکھ میں تھے۔ اوپر لٹکتے بورڈ پر موٹے حروف میں لکھا تھا: ”آپ کو دیکھا جا رہا ہے۔“

پہلی دفعہ جب یہاں آیا تھا تو کیمرے نہیں تھے۔ ”شکر ہے تم نے بروقت بتلایا، ورنہ جانے کیا درگت بنتی۔“ دروازے سے باہر آتے ہوئے امان نے جھر جھری لیتے ہوئے کہا۔ دونوں بنا کوئی چیز اٹھائے پلک

جھپکتے وہاں سے نودو گیارہ ہو گئے۔

”کیا ہوا تمہیں؟“ اماں نے اس کا چہرہ فق ہوتے دیکھا تو دھیمی آواز میں پوچھا، لیکن دوسری طرف مکمل سناٹا تھا۔

کاشان نے دیوار کی طرف اُنگلی اٹھائی۔ نظر پڑتے ہی اماں بھی کانپ کر رہ گیا۔

دیوار پر آویزاں فریم پر لکھے ایک جملے نے انھیں بدل کر رکھ دیا تھا۔ ابھی تک وہ ایک مصنوعی کیمرے کی آنکھ کو دیکھ کر فوراً محتاط ہو جاتے۔ آج انھیں پتا چل گیا تھا کہ کوئی دیکھنے والا انھیں مسلسل دیکھ رہا ہے۔ ان کا ہر عمل نوٹ کیا جا رہا ہے۔ دیوار پر لکھا تھا: ”اللہ دیکھ رہا ہے۔“

دونوں اُلٹے پاؤں پلٹ گئے، ہمیشہ کے لیے۔ کاشان کی امی کی دعا قبول ہو چکی تھی۔

نیکی کا راستہ

ماہین خالد، ٹیکسلا



دوسری طرف کاشان کی والدہ کے ہاتھ دعا کے لیے اُٹھے ہوئے تھے: ”یا اللہ! میرے بیٹے کو سلامت رکھ۔ اے دلوں کے پھیرنے والے! میرے بیٹے کا دل بُرائی سے نیکی کی طرف پھیر دے۔“ ان کی دعا قبول ہوئی تبہ میں اُٹھ کر بھی آج انھوں نے خوب رورو کر دعا کی تھی۔ شاید امی کی دعا کی برکت تھی جو آج وہ کیمرے کی زد میں آنے کے باوجود بال بال بچے تھے۔

”یہاں نہ سہی کہیں اور قسمت آزمائی کرتے ہیں۔“ اماں بایک دوڑاتے ہوئے بول رہا تھا۔ چند لمحوں میں ان کی بایک ایک لمبی چوڑی دکان کے سامنے رکی۔ دونوں بایک سے اُتر کر اندر چلے آئے۔ کاؤنٹر پر ایک نوجوان بیٹھا تھا۔ اندر آتے ہی اس نے دونوں کو بس ایک نظر دیکھا۔ پھر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ ان سے پہلے دو تین گاہک اور بھی موجود تھے۔ اب دونوں ادھر ادھر ٹہلتے، موقع کی تلاش میں تھے۔ احتیاطاً کاشان نے اوپر نیچے نگاہیں دوڑائیں، لیکن کسی کیمرے کا دور دور تک نام و نشان نہ تھا، لیکن دیوار پر ایک جگہ کچھ لکھا دیکھا تو اسے ایک زبردست جھٹکا لگا تھا۔

کہتا کہ اس نے دس مسلمانوں کو شراب کی لعنت سے بچالیا۔ اس کے علاوہ وہ بوڑھی بیوہ کے گھر جاتا اور اسے ہر روز تھوڑی سی رقم اور کھانا دیتا، تاکہ وہ اپنی جائز ضروریات کے لیے کوئی غلط کام نہ کرے۔ وہ بوڑھی بیوہ اسے اپنا بیٹا مانتی تھی۔

میں ہر دفعہ اس سے کہتی کہ اگر تمہارا یہی طریقہ رہا تو کوئی تمہاری لاش کو کندھا بھی نہیں دے گا۔

اس سے وہ کہتا کہ تم اللہ پر بھروسہ رکھو میرا جنازہ بادشاہ وقت اور بڑے بڑے علماء پڑھائیں گے۔“ یہ کہہ کر وہ عورت چپ کر گئی اور بادشاہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس نے اس عورت سے کہا: ”بہن! میں ہی بادشاہ ہوں اور تمہارے شوہر کا جنازہ میں ہی پڑھاؤں گا۔“

عورت بہت خوش ہوئی۔ اس کے بعد بادشاہ نے علماء کرام کو بلایا اس کا جنازہ پڑھایا اور علماء کے قبرستان میں احترام سے اس کو دفن کر دیا۔

انتقام

فاطمہ ناہید، کراچی



ایک بادشاہ اپنے وزیر کے ساتھ بھیس بدل کر گشت لگایا کرتا تھا۔

ایک دن وہ اور اس کا وزیر ایک چوراہے سے گزرے تو انھوں نے وہاں لوگوں کا جھوم دیکھا۔ تمام لوگ ایک لاش کے ارد گرد کھڑے تھے، مگر کوئی اس کے قریب نہ جاتا تھا۔ بادشاہ نے وہاں کھڑے ایک آدمی سے پوچھا کہ لوگ اس لاش کو کندھا کیوں نہیں دے رہے؟

تب ایک آدمی نے بتایا کہ لوگوں نے اسے ہر رات شراب خانے اور ایک بوڑھی بیوہ کے گھر کے باہر دیکھا ہے، اس لیے اس کے غلط کردار کی وجہ سے کوئی اس کو کندھا نہیں دے رہا۔

آخر بادشاہ اس کا گھر کھوجتے کھوجتے اس کے گھر پہنچ گیا اور اس کی بیوی سے اس کے بارے میں پوچھا۔ بادشاہ عام آدمی کے بھیس میں تھا۔ اس لیے کوئی اس کو پہچان نہیں پارہا تھا۔

اس آدمی کی بیوی روتے ہوئے بولی: ”بھائی صاحب! قسم اس خدا کی جس کے قبضے میں میری، آپ کی اور پوری کائنات کی جان ہے۔ میرا شوہر ایک نیک آدمی اور اللہ کا ولی تھا۔ لوگوں نے ہر رات اسے شراب خانے اور بوڑھی بیوہ کے گھر کے باہر تو دیکھا ہے، لیکن سچائی کوئی نہیں جانتا۔ میرا شوہر رات شراب خانے جاتا اور وہاں سے دس مٹکے شراب کے گھر لا کر اسے بہادیتا اور

پیچھے دوڑا۔ کچھ دور جا کر ہرن ٹڈھال ہو گیا۔ شکاری نے ہرن کو گولی مار دی۔ گھوڑے کا انتقام تو پورا ہو گیا، لیکن وہ آج تک اسی لگام سے بندھا زندگی گزار رہا ہے۔

چپل ٹوٹ گئی

علشہ آصف، احمد پور شرقیہ



ایک دن میں کہیں جا رہی تھی کہ میری چپل ٹوٹ گئی
چپل تو موچی سینتا ہے
سینتا تو درزی بھی ہے
درزی تو کپڑے سینتا ہے
کپڑے تو رنگین ہوتے ہیں
رنگین تو لوٹا بھی ہوتا ہے
لوٹا تو واش روم میں ہوتا ہے
واش روم میں تو نل بھی ہوتا ہے
نل تو لوہے کا ہوتا ہے
لوہے کی تو استری بھی ہوتی ہے

کسی جنگل میں ایک گھوڑا اور ہرن دو دوست رہتے تھے۔ ایک دفعہ کسی بات پر دونوں میں جھگڑا ہو گیا۔ ہرن کافی پھرتیلا تھا، لڑائی مار پیٹ تک پہنچ گئی۔ گھوڑے کو زیادہ چوٹیں آئی تھیں۔ دونوں ایک دوسرے سے دور بیگانوں کی طرح رہنے لگے۔

ایک دن گھوڑے نے جنگل میں ایک شکاری کو دیکھا تو اس نے سوچا کہ ہرن سے انتقام لیا جائے۔ وہ شکاری کے پاس گیا اور پوچھا: ”کیا تم کسی ہرن کو شکار کرنے آئے ہو؟“

شکاری: ”ہاں!“

گھوڑے نے کہا: ”میں تمہیں ایک ہرن کا ٹھکانہ بتا سکتا ہوں۔“

شکاری دل ہی دل میں خوش ہوا، یعنی ایک تیر سے دو شکار۔ اس نے گھوڑے سے کہا: ”اگر تم میری مدد کرو تو کیا ہی بات ہے! کیا میں تمہاری پیٹھ پر بیٹھ جاؤں؟“ گھوڑا فوراً راضی ہو گیا۔

شکاری نے پھر کہا: ”اگر تمہیں تکلیف نہ ہو تو میں تمہارے منہ میں لگام ڈال دوں؟“

گھوڑے نے پوچھا: ”اس سے کیا ہوگا؟“

شکاری نے کہا: ”جیسے ہی مجھے ہرن نظر آئے گا میں تمہاری لگام اس طرف موڑ دوں گا۔“

آخر شکاری نے گھوڑے کو لگام ڈالی اور زور سے کھینچا۔ ہرن کے ٹھکانے پر پہنچ کر گھوڑا ہرن کے

پھلوں کی دوکان

عبدالرحمن امجد، ملتان



آج بازار میں معمول سے زیادہ گہما گہمی تھی۔ اتوار کا دن تھا۔ ہر کوئی خریداری کے لیے آیا تھا۔ ہاشو بھائی اپنی پھلوں کی دوکان کی ہر چیز کو قریب سے سجائے بیٹھے تھے۔ ایک عمر ہو گئی تھی اسے پھل بیچتے۔ سفید بال، داڑھی، جھریوں والا چہرہ، پاؤں میں چپل زیادہ خستہ حال نہ تھی، بادامی رنگ کے کپڑے پہنے شکل سے فرشتہ صفت آدمی لگتے تھے۔ سب پھلوں کو صاف ستھرا کر کے پانی سے دھو کے اپنی اپنی جگہوں پر بڑے سلیقے سے سجایا، بگراب کی بارخربوزے میاں کو آم بادشاہ کے ساتھ ہی رکھ دیا۔ دراصل گرمی بہت تھی۔ ہر کوئی پیلے پیلے بیٹھے خربوزے دیکھ کر ان کی جانب لپکتا تھا۔ میاں خربوزے بڑے خوش تھے کہ آج دوکان کی زینت بنے بیٹھے ہیں اور ان کی بڑی قدر ہو رہی ہے۔ ساتھ ہی دیکھتے کہ آم بادشاہ ان پر

استری تو گرم ہوتی ہے
گرم تو کسٹرڈ بھی ہوتا ہے
کسٹرڈ تو پیلا ہوتا ہے
پیلا تو چوزہ بھی ہوتا ہے
چوزہ تو انڈے سے نکلتا ہے
انڈا تو سفید ہوتا ہے
سفید تو دودھ بھی ہوتا ہے
دودھ تو بھینس دیتی ہے
بھینس تو کالی ہوتی ہے
کالا تو انسان بھی ہوتا ہے
انسان تو پان کھاتا ہے
پان تو لال ہوتا ہے
لال تو گلاب بھی ہوتا ہے
گلاب میں تو کانٹے ہوتے ہیں
کانٹے تو مچھلی میں بھی ہوتے ہیں
مچھلی تو پانی میں ہوتی ہے
پانی میں تو کشتی ہوتی ہے
کشتی میں تو لوگ ہوتے ہیں
لوگ تو روڈ پر بھی ہوتے ہیں
روڈ پر تو میں بھی چلتی ہوں
چلنے سے خوب یاد آیا
کہ میری چپل ٹوٹ گئی

اقبال اور غالب جیسے عظیم لوگ آپ کے چاہنے والوں میں شامل تھے۔ میری کیا مجال.....“

آم بادشاہ تو گویا پھولے نہ سارے تھے۔ کہنے لگے: ”ہم تمہاری عرضی پر غور کرتے ہیں۔“

ابھی کچھ اور کہنا چاہتے تھے کہ ہاشونے آم بادشاہ کو ہاتھ میں دبوچ کر ایک گاہک سے کہا: ”جناب! انھیں دیکھیے لا جواب آم ہیں۔ خاص سندھ سے منگوایا ہے۔“

”کتنے میں دو گے؟“ گاہک بولا۔

”ویسے تو بھائی اڑھائی سو ہے، مگر آج آپ کے لیے صرف دو سو روپے کلو۔“

”ڈیڑھ سو ٹھیک ہے۔ سارے تول دو۔ آج دعوت کا اہتمام کرنا ہے۔“

”جو حکم۔ یہ پانچ کلو ہوتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے دے دو۔ یہ لو آٹھ سو۔ باقی تم رکھ لو۔“

”شکریہ۔“

اور اسی کے ساتھ ہی آم بادشاہ کی سلطنت دوکان سے شاپر میں منتقل ہو گئی۔ انھیں خربوزے کے سامنے اپنی شکست محسوس ہو رہی تھی۔ ہارے ہوئے جواری کی طرح اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولے: ”جلد ہی تمہارا انجام بھی یہی ہوگا۔ ہاشو اور آدمی آم کی آواز سن پاتے تو حیران رہ جاتے۔ خربوزہ کچھ سوچ کر مسکرا رہا تھا۔

برہم دکھائی دے رہے ہیں۔ ہاشو کو دوکان سے باہر جاتا دیکھ کر اس کی تو سٹی گم ہو گئی۔

”کیوں میاں! تمہاری یہ جرات آج تخت شاہی پر آ بیٹھے۔“ آم خفگی سے بولا۔

دراصل آم اپنے خانے کو کسی صورت بھی تخت شاہی سے کم نہ سمجھتے تھے، سو بولے: ”آج یہاں آ بیٹھے ہو، کل کے معلوم ہمیں یہاں سے دھکائی دے ڈالو۔“

خربوزہ منکسر انداز میں بولا: ”حضور! جان کی امان پاؤں تو کچھ عرض کروں۔“

یہ سن کر تو آم فخر سے اڑ گیا۔ دوسرے پھلوں کے سامنے فیاضی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا: ”امان ہے، تم بھی کیا یاد رکھو گے۔“

خربوزہ کچھ خوشامدانہ انداز میں بولا: ”حضور! بندہ تو ناچیز ہے۔ میری کیا مجال جو آپ کی برابری کروں۔ حضور سے ہی قریب کا یہ فیض ہے کہ مجھے فرش سے عرش تک پہنچا دیا۔ حضور کا نمک خوار ہوں۔ حضور کا وفادار رہوں گا۔ ایسا کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔“

خربوزے میاں کی تو جان پر بنی ہوئی تھی۔ وہ آم کو ہاشو کے آنے تک باتوں میں الجھائے رہنا چاہتا تھا۔ چالپوسی کرتے ہوئے کہا: ”مجھ خاک کی کیا اوقات ہو سکتی ہے۔ نام تو آپ کا ہے۔ ہر گھر میں آپ کا چرچا ہے۔ بچے ہوں یا بوڑھے سب ہی حضور کے دیوانے ہیں۔ ذیابیطس کے مریض منع ہونے کے باوجود حضور سے محبت فرماتے ہیں۔

سچی لگن

وجہرندیم، کراچی



باتوں میں لگے ہوئے تھے۔ اسی بدتمیزی کے دوران پیریڈ کی گھنٹی بجی۔ پھر دوسرے پیریڈ میں بھی اسی قسم کی صورت حال رہی۔ چھٹی کے بعد ساریہ گھر پہنچ کر ٹڈھال سی سونے پر گر گئی۔ امی بولیں: ”ساریہ بیٹا! کیا ہوا، کھانا تو کھا لو۔“

ساریہ غصے سے بولی: ”امی! میں کل سے اسکول نہیں جاؤں گی۔ سوائے کھیل مناشے کے وہاں اور کچھ نہیں ہوتا۔ اتنا شور ہوتا ہے کہ مس کی کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی۔ اب میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں اسکول نہیں جاؤں گی۔“ ساریہ روتے ہوئے اپنے کمرے چلی گئی اور دھڑام سے دروازہ بند کر لیا۔

شام کو امی ساریہ کے پاس گئیں جو ٹیوشن جانے کے بجائے سونے پر سر پکڑے بیٹھی تھی۔ امی نے سمجھاتے ہوئے کہا: ”دوسروں کی حرکتوں اور لاپرواہیوں کی وجہ سے تم خود اپنا نقصان کر لو گی۔ اگر اور لوگ جہالت کے اندھیرے میں ڈوب رہے ہیں تو کیا تم علم کی روشنی کی طرف نہیں بلاؤ گی ساریہ!“

بات ساریہ کی سمجھ میں آ گئی۔ ساریہ نے عہد کیا کہ وہ نہ خود علم سے پیچھے ہٹے گی بلکہ دوسروں کو بھی جذبہ دلائے گی۔ اس نے اگلے دن سے ہی ”علم پھیلاؤ مہم“ کا آغاز کر دیا اور کچھ دن بعد ہی اس کا بہت اچھا نتیجہ سب کے سامنے آیا۔ ساریہ کی جماعت کی طالب علموں کا سالانہ امتحان میں اچھی کارکردگی کا مظاہرہ ایک روشن ستارے کی طرح چمک رہا تھا۔

”بے وقوف! تم تو بہت ہی بے وقوف ہو۔ ہر وقت پڑھنے کے علاوہ تمہیں کچھ آتا ہی نہیں۔ تم تو کتابی کیڑے کی طرح کتابوں میں دماغ خراب کرتی رہتی ہو۔ بابا!“ اریبہ نے ساریہ کو اپنی بدتمیزی کا نشانہ بنایا۔ ساریہ کلاس کی سنجیدہ ترین اور اول نمبر پر آنے والی طالبہ تھی۔ جو فالتو وقت برباد کرنے کے بجائے، اسے پڑھنے میں صرف کرتی۔ کیمسٹری کا پیریڈ تھا۔ سر اشتیاق زور و شور سے ”ایٹم“ پر لیکچر دے رہے تھے۔ اس دوران بھی طلبہ باتوں میں مصروف تھے۔ ماریہ اور آمنہ ایک دوسرے کی کتابوں پر سائنس دانوں کی ڈاڑھی مونچھیں بنانے میں مصروف تھیں۔ حلیمہ اور سلیمہ لیکچر سننے کے بجائے ”قائد اعظم کے چودہ نکات“ بڑبڑا رہی تھیں۔ علیہ کا دھیان کھانے کی طرف تھا۔ باقی سب سرگوشیوں میں دنیا جہان کی



آدھی ملاقات

شامل اشاعت بیشتر خطوط ہمدرد
نوناہل اکتوبر ۲۰۱۹ء سے متعلق ہیں

بوجھے مثالی سلسلہ ہے۔ اس سے شخصیت کے بارے میں مکمل معلومات حاصل ہو جاتی ہیں۔ شین شرارت مزے دار ہے۔ سفر نامہ امریکا دل چپ ہے۔ اسے تصویروں نے دل کش بنا دیا ہے۔ کہانیوں میں غلط فہمی، کچی ہستی اور گھوڑے کا سودا پسند آئیں۔ ان کے علاوہ پرانے کھنڈر کا بھوت، آنے والا دور اور ہمارا کارنامہ بھی خوب ہیں۔ بلا عنوان کہانی اپنی مثال آپ ہے۔ فٹ بال سازی، اردو اخبارات کی تاریخ اور ڈائمنڈ ساز دل چپ مضامین ہیں۔

عشرت جہاں، لاہور

ماہ اکتوبر کا ہمدرد نوناہل دیکھ کر بہت خوشی ہوئی سرورق پر خوب صورت سے بچے کی تصویر بہت ہی پیاری ہے۔ ماشاء اللہ سلیم کوثر کی ”حمد باری تعالیٰ“ بہت زبردست تھی۔ جاگو جگاؤ میں شہید پاکستان حکیم محمد سعید کی دل کو چھونے والی باتیں بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ سلیم مغفل کی پہلی بات نے تو سچ ہمیں آنسوؤں سے رلا دیا۔ عظیم قائد کے بارے میں حکیم صاحب کی یادوں کا کلکڑا بہت زبردست تھا۔ ۱۵ اکتوبر کے حوالے سے نظم (استادوں کا دن) بہت اچھی تھی۔ جیک ماجیتا جاگتا معاشی جادوگر بہت اچھی تحریر تھی جو لوگ بہت جلد ہر معاملے میں مایوس ہو جاتے ہیں ان کو جیک ماسے سبق سیکھنا چاہیے۔ محمد اسماعیل عبدالعزیز کی تحریر

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمدرد نوناہل کا معیار ہرگز رتے دن کے ساتھ بلند ہو رہا ہے۔ سرورق پر معصوم بچوں کی خوب صورت تصاویر دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے۔ بالخصوص ستمبر کا سرورق بہترین تھا۔ آپ سے گزارش ہے کہ ایسے ہی معصومیت کو سرورق کی زینت بناتے رہیں اور ہماری آنکھیں حقیقت کی جانب کھولتے رہیں۔ اسی میل کے ذریعے خط و کتابت کا طریقہ بتا سکتے ہیں؟

صبا ناز صدیقی، حیدر آباد

جس طرح آپ نے یہ خط ہمیں اسی میل سے بھیجا ہے اسی طرح دوسری تحریریں بھی ان بیچ میں ٹائپ کر کے بھیج سکتی ہیں۔ انعامی سلسلوں کے لیے اصل کو پرن ضروری ہے۔

ماہ اکتوبر کے شمارے کا خوب صورت سرورق بہت بھایا۔ گرم ٹوپی اور چادر نے جاڑے کا احساس دلایا۔ پہلے صفحے کا پیغام بامعنی ہے۔ حمد باری تعالیٰ بھی بے حد خوب صورت اور پیش کش کا انداز بھی بہت خوب۔ جاگو جگاؤ اور پہلی کے بعد عظیم قائد کی ایک عظیم خوبی سے استفادہ کیا۔ ثابت قدمی اور اولوالغری کی صفات سے آراستہ جیک ماسے تعارف اچھا لگا۔ زندہ پیغام ایک تاثراتی تحریر تھی، بہت اچھی لگی۔ سام باؤس کا اسرار ختم ہوا۔ دونوں حصے تجسس سے بھرپور تھے۔ نام

زندہ پیغام پڑھ کر بہت حیرت ہوئی اور مزہ آیا۔ روشن خیال پڑھ کر بچوں کے ذوق کا اندازہ ہوتا ہے۔ سام ہاؤس کا دوسرا ٹکڑا پڑھ کر تشنگی دور ہو گئی اور سکون ملا۔ نام بوجھیے بہت مشکل لگ رہا ہے، لیکن پڑھنے میں تو بہت مزہ آ رہا ہے۔ شین شرارت نے ہونٹوں پر ہنسی بکھیر دی۔ گاؤں میں بارش (رفیع یوسفی محرم) نظم بھی بہت اچھی تھی۔ ڈائوسارز (سیدہ صدف اکبر) کی تحریر خوف ناک تصاویر کے ساتھ بہت ہی معلوماتی تھی۔ نوہال مصور میں بچوں نے کمال کر دیا ایک سے بڑھ کر ایک یوں ہی کوشش کرتے رہیں۔ سلیم مغل کی نئی منزلوں کا سفر پڑھنے میں مزہ آ رہا ہے۔ معلومات بھی مل رہی ہے۔ پرانے کھنڈر کا بھوت (جاوید اقبال) پہلے بہت ڈر لگا، لیکن جب حقیقت معلوم ہوئی تو ڈر ختم ہو گیا۔ محمد ذوالقرنین کی تحریر ”غلط فہمی“ بہت اچھی اور سبق آموز تھی۔ علم در پیچے میں بچوں نے بہت محنت سے معلومات جمع کی ہے، بہت زبردست تھا۔ کہانی کچی بستی بہت اعلا اور زبردست تھی۔ آنے والا دور پڑھ کر بہت اچھا لگا، مگر ڈر سا محسوس ہو رہا ہے۔ نسرین شاہین کی تحریر ”فش بال سازی“ پڑھ کر معلومات ملی۔ تنویر انجم کی نظم ”دریا کے پار جانا“ بہت اچھی لگی، پورے پاکستان کی یہ کرا دی۔ نوہال خبر نامہ پڑھ کر مزہ آیا۔ خرم فرخی آخر کہاں سے ایسی خبریں جمع کرتے ہیں۔ ٹکیلی صدیقی کی ”گھوڑے کا سودا“ بہترین کہانی تھی۔ ہمارا کارنامہ (علی حیدر) کی تحریر ہم مسکرا مسکرا کر پڑھتے رہے۔ اس بار کی بلا عنوان کہانی (طلحہ) بہت اچھی تھی۔ ٹکیلی صدیقی کی اخبارات کی تاریخ پڑھ کر معلومات میں

اضافہ ہوا۔ نوہال ادیب میں سارے بچوں نے بہت اچھا اور محنت سے لکھا۔ آخر میں لغت پڑھ کر کچھ اور الفاظ کا ذخیرہ حاصل ہو۔ دعا ہے کہ ہمدردیوں ہی صدا بہار ہے۔

ایم ایمن محمد عقیل شاہ کراچی

ہمدرد نوہال ایک قومی اثاثہ ہے۔ اس کے بانی حکیم محمد سعید ایک عظیم انسان تھے۔ ان کو شہید کرنے والے واقعی انسان نہیں درندے تھے۔ کہانیاں، نظمیں، علم در پیچے، معلومات، تصاویر غرض ہر لحاظ سے رسالہ زبردست ہے اور اس کے پیچھے دن رات کی محنت اور کام سے محبت کرنے والی ٹیم ہے۔

محمد عدیل حسنین، جھنگ صدر

ماہ اکتوبر کے سرو ورق پر نظر پڑی تو منہ سے نکلا۔ ماشاء اللہ، اندر ایک سے ایک تحریروں کی فہرست دیکھی۔ ابتدا سلیم کوثر کی حمد باری تعالیٰ سے کی۔ جاگو جگاؤ اور پہلی بات ہمیشہ کی طرح خوب تھی۔ شہید حکیم محمد سعید کی خوب صورت اور یاد رکھنے والی باتوں نے دل میں جگہ بنا لی۔ پہلی بات میں لیاقت علی خان اور شہید حکیم محمد سعید کی شہادت کا واقعہ پڑھ کر دل میں پاکستان سے زیادہ محبت جاگ اٹھی۔ نظم استادوں کا دن پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ سب کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھی۔ نوہال مصور میں اصغر علی کوثری اور لیزا جاوید خان کی پینٹنگ اچھی لگی پورے شمارے میں ہر چیز اپنی مثال آپ تھی۔

حمزہ محمد عقیل شاہ، کراچی

اکتوبر کا شمارہ ہر بار کی طرح بہت اچھا لگا۔ ساری کہانیاں

ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ خاص طور پر مجھے ”جیک ما“ کی داستان بہت پسند آئی۔ نیا سلسلہ شین شرارت بہت پسند آیا۔ بلا عنوان کہانی کی تو کیا بات تھی۔ مزاحیہ کہانیوں میں ہمارا کرنا بہت اچھی کہانی لگی۔

سیدہ افرام، حیدر آباد

ہم سب کو ہمدردونہال بہت پسند ہے۔ یہ ہمارا دل چسپ اور معلوماتی رسالہ ہے۔ نوہال کی کہانیاں اور تصویریں بھی بہترین ہوتی ہیں۔ تازہ شمارے کا سرورق بہت اچھا ہے۔ تحریروں میں جاگو جگاؤ، پہلی بات، روشن خیالات، نام بوھچے، ڈانوساز، شین شرارت، نئی منزلوں کا سفر، پرانے کھنڈرات کا جھوٹ، غلط فہمی، فٹ بال سازی، گھوڑے کا سودا، کچی بستی، نوہال لغت، بہت پسند آئیں۔ ہمیں نوہال سے معلومات کے ساتھ تفریح بھی ملتی ہے۔ یہ پرچامیرے دادا، نانا، دادی، نانی، ابو، امی اور بزرگوں نے بھی اپنے بچپن میں پڑھا ہے۔

سیدہ ناہیدہ نرس، کراچی

اکتوبر کا شمارہ بہت دل چسپ تھا۔ تمام کہانیاں ہمیشہ کی طرح بہت زبردست تھیں۔ شین شرارت بھی اچھا تھا۔ تمام نظمیں بھی بہت پیاری تھی۔

اساخان، میرپورخاص

ستمبر کا رسالہ پڑھ کر دل خوش ہو گیا۔ نوہال مشاعرے کے شعر بہت پسند آئے۔ زمین سے آگے پڑھ کر معلومات کا خزانہ ہاتھ لگا۔ تیلیوں کا مضمون بہت دل چسپ تھا۔ سام ہاؤس ایک دل چسپ تحریر ہے۔

کبھ اور میں، کراچی

اکتوبر کے شمارے کا سرورق بہت اچھا لگا۔ سام ہاؤس اور بلا عنوان کہانی اچھی لگیں۔ نوہال مشاعرے کی کمی محسوس ہوئی۔ رسالے میں جوتبدیلیاں ہوئیں ہیں، اس سے یہ ہمارا اور زیادہ محبوب ہو گیا ہے۔ کیا امی میل سے مختلف تحریریں بھیجی جاسکتی ہیں؟

شیراز شاہ، سرگودھا

جی ہاں، لیکن ہر تحریر کے نیچے پناڈاک کا پتا ضرور لکھیے۔

ستمبر کا شمارہ ہمیشہ کی طرح اے ون تھا۔ نھی چڑیا سے لے کر نوہال لغت تک ہر تحریر بہت پسند آئی۔ سفر نامہ امریکا کے صفحات زیادہ کریں پلیز..... پڑھ کر مزہ آتا ہے۔ میاں بلاتی شاید کافی عرصے بعد میدان میں آئے ہیں۔ شین شرارت نے بہت ہنسایا۔ زمین سے آگے اور تتلیاں حیرت میں ڈالنے والے مضامین تھے۔ شرفو کی کہانی سبق آموز تھی۔ بغداد کا تاجر، میں تاجر کے دوست پر تھوڑا غصہ آیا۔ بلا عنوان کہانی اور بچا شینی باز اچھی لگیں۔ بہر حال تمام سلسلے اور کہانیاں زبردست رہیں۔

امجد احمد، آزاد کشمیر

ہمدردونہال پہلی بار پڑھا، بہت مزا آیا بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔ کاش بھائی نے پہلے ہی نوہال پڑھنے کا مشورہ دیا ہوتا تو اب تک بہت کچھ سیکھنے کو ملتا۔ حمد باری تعالیٰ سے پڑھنا شروع کیا۔ جاگو جگاؤ نے واقعی جگا دیا۔ عظیم قائد تو میرے ہیرو ہیں۔ ان کی تو ہر بات بے مثال ہوتی ہے۔ جیک ما، زندہ پیغام، سام ہاؤس، پرانے

کھنڈرات کا بھوت سب ہی نے بہت متاثر کیا۔ نام بوجھے میں بہت مشکل درپیش ہوئی، مگر مجھے بہت مزہ آیا۔ شکریہ ہمدردنوںہال کا۔

محمد عزیز محمد نعیم، کراچی

اکتوبر کا شمارہ آنکھوں سے ہوتا ہوا دل میں اُتر گیا۔ حمد سے لے کر لغت تک سب اچھا تھا۔ عظیم قائد نے یادیں تازہ کر دیں۔ جبکہ ما پڑھ کر مایوس ہونے والوں کی قسمت پر رون آ یا۔ غلط فہمی لا جواب تھی۔

اشتیاق سرور اعموان، اسلام آباد

ستمبر کا شمارہ دیکھ کر دل خوشی سے باغ باغ ہو گیا۔ چچاشنی باز بہت مزاحیہ کہانی تھی۔ ہنسی رکتی ہی نہیں تھی۔ شین شرارت بھی بہت مزے کا تھا۔ ہنس ہنس کر پیٹ میں درد ہو گیا۔

زہرہ کنول اعموان، مظفر گڑھ

اکتوبر کا شمارہ میں نے پہلی بار جب پورا پڑھا تو مجھے وہ کچھ حاصل ہوا جس کا مجھے وہم و گمان بھی نہیں تھا۔ خصوصاً مجھے علم در پیچے میں زندگی گزارنے کے وہ اصول بتائے گئے جن سے میں ناواقف اور انجان تھا۔ بس علم در پیچے نے میری کایا پلٹ ڈالی۔ میں نے عہد کیا کہ آئندہ ”ہمدردنوںہال“ جیسے عظیم رسالے میں ضرور شریک رہوں گا۔

محمد حذیفہ بن عبدالستار کراچی

اکتوبر کا شمارہ بہت اچھا لگا۔ جاگو جگاؤ سے اچھا سبق ملا۔ بلا عنوان کہانی بہترین تحریر تھی۔ شین شرارت پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ ہمارا کارنامہ اچھی تحریر تھی۔

حافظ سیف اللہ پٹھان، کراچی

اس بار نونہال بروقت ۲ اکتوبر کو ہی مل گیا بہت خوشی ہوئی۔ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی نونہال کی تحریروں بہترین ہیں کچھ پڑھ لیں، کچھ زیرِ مطالعہ ہیں۔ انکل! ہم بہت شوق اور لگن سے معلومات افزا، بلا عنوان کہانی، نونہال مشاعرہ اور نام بوجھے جیسے مستقل سلسلوں میں ہر بار حصہ لیتے ہیں اور جلد از جلد جواب بھیجے کی کوشش کرتے ہیں، تاکہ قرضہ اندازی میں ہمارا نام بھی شامل ہو سکے۔

زیر بن اشعر، زباب فاطمہ، بحرین اشعر، کورنگی، کراچی

اکتوبر کا شمارہ ہر لحاظ سے سپر ہٹ تھا۔ جاگو جگاؤ میں ہمدردی سے متعلق اچھا سبق ملا۔ پہلی بات میں سلیم مغل دو عظیم ہستیوں کا الم ناک سانحہ سنار ہے تھے۔ پڑھ کر دل بے حد مغموم ہوا۔ استادوں کا دن اچھی نظم تھی۔

”جیک ما“ ایک انوکھے انسان کی کامیابیوں کے متعلق پڑھ کر اندھیروں کے درمیان ایک روشنی کی کرن نظر آئی۔ زندہ پیغام میں محمد اسماعیل عبدالعزیز صاحب اس عظیم انسان کے اخلاق بیان کر رہے تھے جس کی بے لوث محنت کی بدولت آج ہم جیسے ناکارے بھی لکھنے کے قابل ہو گئے۔ سام ہاؤس اچھی تحریر تھی۔ نام بوجھے کا نام بوجھنے سے معذور رہے۔ شین شرارت پڑھ کر بے حد محظوظ ہوئے۔ ڈائنوسار معلوماتی تحریر تھی۔ نئی منزلوں کا سفر پڑھ کر اچھا لگا۔ غلط فہمی معاشرتی تحریر تھی۔ فٹ بال سازی پڑھ کر وطن عزیز کے لیے دعا گو ہو گئے۔ ہمارا کارنامہ، مزاحیہ تحریر تھی۔ بلا عنوان کہانی میں لڑکے کی ذہانت پر رشک آیا۔ کاش ہم بھی ایسے ذہین

ہوتے۔ اردو اخبارات کی تاریخ سے اردو کی اہمیت کے بارے میں مزید شناسائی ہوئی۔ نونہال ادیب میں محمد سعد اسد سب پر بازی لے گئے۔ پورا شمارہ اچھا لگا۔

زیر سلطان محمود، کراچی

اکتوبر کے شمارے میں ”جیک ما“ کی کہانی میں محنت کرنے کی ترغیب دی اور یہ بھی بتایا کہ محنت کر کے انسان کو کسی بھی موقع پر ہار نہیں ماننی چاہیے۔ زندہ پیغام، سام ہاؤس میں بھی بہت زیادہ مزہ آیا۔ شین شرارت اس بار بہت اچھی رہیں۔ ڈائمنساری کی تحریر پڑھ کر یہ علم ہوا کہ ڈائمنساری کو سب سے پہلے کس نے دریافت کیا۔ پرانے کھنڈرات کا بھوت نے بہادری کا جذبہ پیدا کر دیا۔ اس بار کے علم درستی نے زندگی گزارنے کا جو سبق دیا وہ اتمول ہے۔ اس کے علاوہ کچی بستی میں پڑوسیوں کے ساتھ میل جول، حسن سلوک کا ایک خاص سبق دیا۔ آنے والا دور کی تحریر میں جو بات ہے، اگر یہ بات موجودہ دور میں دیکھی جائے تو یہ دو رکئی گنا زیادہ بڑھ چکا ہے۔ فٹ بال سازی میں الحمد للہ پاکستان کے مشہور شہر سیالکوٹ کے بارے میں وہ کچھ معلوم ہوا جو میرا ذہن بھی تسلیم نہیں کر رہا تھا کہ سیالکوٹ کی بنی ہوئی فٹ بال دنیا کے ایک عظیم ورلڈ کپ میں استعمال ہوئی ہے۔ نونہال خبرنامہ، گھوڑے کا سودا بہت اچھی تحریریں تھیں۔ ہمارا کارنامہ میں وہ مزہ آیا جو شین شرارت میں بھی نہیں تھا۔ پھر بھی اس بار پورے رسالے میں بہت مزہ آیا اور ہم بہت زیادہ لطف اندوز ہوئے۔

محمد سہیل تونسوی، کراچی

اکتوبر کا شمارہ ملا۔ سرورق خوب تھا۔ کہانیاں بھی زبردست تھیں، جن میں غلط فہمی، کچی بستی، سام ہاؤس

اور آنے والا دور دل چپ تھیں۔ گھوڑے کا سودا بہت مزاحیہ تھی۔ نظموں میں استاد کا دن، گاؤں میں بارش اور دریا مزے دار تھیں۔ غرض کہ رسالہ شان دار تھا۔

علی حیدر، جھنگ صدر

کہانیاں ”گھوڑے کا سودا“ اور ”ہمارا کارنامہ“ بہت پسند آئیں۔ بلا عنوان انعامی کہانی بھی بہت مزے کی تھی۔ رسالے میں اپنا نام نہ پا کر بہت دکھ ہوا۔

اقرا نصیر احمد، ٹیکسلا

آپ ایسی تحریر بھیجیں جو دل چپ ہو۔ جو پڑھے اس کے منہ سے واہ نکلے۔

ہمدرد نونہال میرا پسندیدہ رسالہ ہے۔ نظم نضی چڑیا اور شین شرارت کے لطائف بہت اچھے تھے۔ کہانیوں میں بخدا کا تاجر، شرفو کی کہانی، بلا عنوان کہانی بہت اچھی تھیں۔ پورا رسالہ پڑھے بغیر ہاتھ سے چھوڑنے کو دل نہیں کرتا۔ ان شاء اللہ ہمدرد نونہال ہمیشہ ہمارا ساتھ قائم رہے۔

محمد شعیب، کراچی، کیمڑی

اس ماہ کا شمارہ بھی ہمیشہ کی طرح بہترین تھا۔ جاگو جگاؤ اور پہلی بات سے بہت سبق ملا۔ شین شرارت کے لطیفے بہت عمدہ تھے۔ استادوں کا دن پسند آئی۔ ڈائمنساری پڑھ کر علم میں اضافہ ہوا۔ نونہال مصور کی تصاویر بہت خوب تھیں۔ کہانیوں میں غلط فہمی، کچی بستی، آنے والا دور اچھی لگی۔ بلا عنوان اس مرتبہ بہت اچھی تھی۔ کہانی میں مقصد بہت واضح تھا کہ عقل کی دولت انسان کو ہمیشہ کامیاب کرتی ہے۔ نونہال ادیب میں شہید پاکستان پڑھ کر میں بہت اُداس ہوں۔ بس میری دعا ہے کہ اللہ انکل حکیم محمد سعید کو جنت الفردوس میں بلند درجے عطا فرمائے۔ آمین۔

سعد محمود، حیدرآباد

بلا عنوان کہانی کے انعامات

ہمدرد نونہال اکتوبر ۲۰۱۹ء میں محترمہ ظلِ حنا کی بلا عنوان انعامی کہانی شائع ہوئی تھی۔ اس کہانی کے بہت اچھے اچھے عنوانات موصول ہوئے۔ کمیٹی نے بہت غور کرنے کے بعد تین اچھے عنوانات کا انتخاب کیا ہے، جو تین نونہالوں نے مختلف جگہوں سے بھیجا ہے۔

۱۔ نقطے کا نکتہ : محمد عباس شیخ، کراچی

۲۔ نقطہ داں : سیدہ سالکہ محبوب، کراچی

۳۔ عقل عیار : محمد سعید، کالا گجراں

﴿چند اور اچھے اچھے عنوانات یہ ہیں﴾
 ہیرا پھیری۔ نقطوں کا کمال۔ ایمان دار شاطر۔ کھیل نقطوں کا۔
 ذہانت کا کھیل۔ گٹھلیوں کے دام۔ عقل کی جیت۔

ان نونہالوں نے بھی ہمیں دل چسپ عنوانات بھیجے

☆ کراچی: محمد علی محمد الطاف، عادل امیر، فضل سلیمان، سہیل خان احمد علی شاہ، غلام محمد سرور، صادق، محمد ناصر علی، سمیر علی، شہباز خان بن سرفراز خان، زوہیب خورشید خان، محمد عباس زاہد، محمد زبیر احمد، آصف علی، حسان فیصل، مدثر، غلام محمد دلاور، اعجاز احمد، عبید سر دار، محمد عدنان سیفیل، اُسید الرحمن، رباب فاطمہ، عمیر طیب خان، سیدہ ناہیدہ نرگس، حافظہ عروبہ مرسلین، وائنا جنید، علینا اختر، عبدالرحمن عارف، نور العین، محمد سعد اللہ، راد بشیر، کشف

کاشف، فاطمہ ناہید، مصاص شمشاد غوری، محمد اسامہ رفیق، مجتبیٰ احمد، خدیجہ سراج، عمر سلمان، سید شہنظل علی انظہر، سیدہ مریم محبوب، سیدہ جویریہ جاوید، سید نیشل علی انظہر، سید عفاف علی جاوید، حافظ سیف اللہ پٹاوری، محمد سہیل تونسوی، زبیر سلطان محمود، زینب علی، عفان احمد انصاری، سدرہ عابد، یمنی بنت صدیق بکر، رابعیہ، حمزہ محمد عقیل شاہ، سید محمد احمد، ماہم طارق، رشنا جمالدین، آمنہ بختاور، زینب ناز سلطان، وردہ مصطفیٰ، محمد عاقب مصطفیٰ، حسان خالد ☆ لاہور: رامین سجاد، حفصہ سجاد، زین العابدین، امتیاز علی ناز ☆ ٹیاری: راحیل جان بہلم پٹھان، ماریہ خان بہلم پٹھان، فرح خان بہلم پٹھان ☆ راولپنڈی: ماہین خالد، محمد جواد عباسی، زہرا نور بٹ، شاز راہد، ملک محمد احسن ☆ حیدر آباد: امامہ تجل، حیان مرزا، محمد یوسف قریشی، عائشہ ایمن عبداللہ، سعد محمود ☆ ڈیرہ غازی خان: عفت سراج، رفیق احمد ناز ☆ اسلام آباد: اشتیاق سرور اعوان ☆ میرپور خاص: محمد جنید تحسین، اسما خان ☆ ڈیرہ اسماعیل خان: محمد احتشام خان ☆ خانیوال: محمد گوش خان ☆ تلہ گنگ: محمد حسان عبداللہ ☆ ملتان: محمد تیمور ☆ کوئٹہ: سید عمر ☆ مظفر گڑھ: احمد خان لغاری ☆ کوٹ ادو: شاہ زیب مختار ☆ پرانا سکھر: محمد حبیب ☆ جھنگ صدر: علی حیدر، محمد عدیل حسنین ☆ میرپور: محمد منزل احمد، محمد سلیم ملک ☆ دینہ: محمد عبداللہ حسن ☆ پھل شہر: فیجہ عمران پھل ☆ بہاول پور: حمزہ ریاض ☆ ٹنڈوالہیار: مدر آصف کھتری ☆ آزاد کشمیر: اصح احمد ☆ پتا نامکمل: امتہ البدیع، محمد عزیز محمد نعیم، محمد ذیشان اسجاد۔

سابقہ سامع	سابقہ سامع
پیشہ پیشہ	پیشہ پیشہ
کالا کالا	کالا کالا
پیشہ پیشہ	پیشہ پیشہ
محاسن محاسن	محاسن محاسن
مشتی مشت	مشتی مشت
مخلی مخلی	مخلی مخلی

زیرِ بوم	زے ر و ب م	نشیب و فراز۔ آواز کا اتار چڑھاؤ۔
دھارا	د ہَا ر ا	چشمہ۔ آبشار۔ پانی بہنے کی جگہ۔ دریا کے وسط میں پانی کا بہاؤ۔
منجستہ	م ی خ ب س ن تہ	سردی سے برف کی طرح جما ہوا۔
سارنج	سَا ن چ	سچ۔ حق۔ راست۔
ٹھاٹھ	ٹھا ٹھ	ڈھنگ۔ ناز و انداز۔ شان و شوکت۔ کروفر۔ آن بان۔
غار	عَا ر	گہرا۔ وسیع۔ نشیب۔
فراست	فِ رَ اس ت	دانائی۔ عقل مندی۔ سمجھ داری۔ قیافہ۔
حلف	ح ل ف	قسم کھانا۔ قسم۔ عہد۔ پیمان۔
فوق	ف ق	خوف یا حیرت سے چہرے کا رنگ سفید پڑ جانا۔ ہکا بکا۔
اشتعال	ا ش تِ عَا ل	غصہ دلانا۔ ابھارنا۔ بھڑکانا۔ جوش۔ شعلہ۔
مقالہ	م قَا لَہ	کبھی ہوئی بات۔ قول۔ مقولہ۔ تحریر۔
کاشانہ	کَا شَا نَہ	جھوپڑا۔ آشیانہ۔ گھونسلہ۔
خاکسار	خَا کِ سَا ر	خاک کی مانند۔ عاجز۔ حقیر۔
حاوی	حَا وِ ی	گھیرنے والا۔ احاطہ کرنے والا۔ چھا جانے والا۔
شاد	شَا د	خوش۔ مسرور۔ بے غم۔
اٹل	ا ٹ ل	جواپنی جگہ سے نہ ہل سکے۔ نہ ٹلنے والا۔ اڑ جانے والا۔ قطعی۔
مدح	م د ح	تعریف۔ توصیف۔ ثنا۔ مدحت۔ وہ نظم جس میں کسی کی تعریف کی گئی ہو۔